میکیاولی اور میکیاولیت

ایک مطالعہ

مصنف

پروفیسر سید انوار الحق حقّی

ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

Mechiavelli Aur Mechiavelliat

By

Prof. Syed Anwar ul Huq Haqqi

سنہ اشاعت : جنوری، مارچ 1989 شک 1911

پہلا اڈیشن : 1000
قیمت : 8/=
سلسلۂ مطبوعات ترقی اردو بیورو 528

ناشر : ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک 8 آر کے پورم نئی دہلی- 110066
طابع : جے کے آفسیٹ پرنٹرز 3/5 جامع مسجد- دہلی 110006

پیش لفظ

ہندوستان میں اردو زبان وادب کی ترقی وترویج کے لیے ترقی اردو بیورو (بورڈ) قائم کیا گیا۔ اردو کے لیے کام کرنے والا یہ ملک کا سب سے بڑا ادارہ ہے جو دو دہائیوں سے مسلسل مختلف جہات میں اپنے خاص خاص منصوبوں کے ذریعہ سرگرم عمل ہے۔ اس ادارہ سے مختلف جدید اور مشرقی علوم پر مشتمل کتابیں خاصی تعداد میں سماجی ترقی، معاشی حصول، عصری تعلیمی اور معاشرہ کی دوسری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے شائع کی گئی ہیں جن میں اردو کے کئی ادبی شاہکار، بنیادی متن، قلمی اور مطبوعہ کتابوں کی وضاحتی فہرستیں، تکنیکی اور سائنسی علوم کی کتابیں، بچوں کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت، زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شامل ہیں۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مختصر عرصہ میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ترقی اردو بیورو نے اپنے منصوبوں میں کتابوں کی اشاعت کو خاص اہمیت دی ہے۔ کیوں کہ کتابیں علم کا سرچشمہ رہی ہیں اور بغیر علم کے انسانی تہذیب کے ارتقا کی تاریخ مکمل نہیں تصور کی جاتی۔ جدید معاشرے میں کتابوں کی اہمیت مُسلّم ہے۔ بیورو کے اشاعتی منصوبہ میں اردو انسائیکلو پیڈیا، ذولسانی اور اردو۔ اردو لغات بھی شامل ہیں۔

ہمارے قارئین کا خیال ہے کہ بیورو کی کتابوں کا معیار اعلا پائے کا ہوتا ہے اور وہ ان کی ضرورتوں کو کامیابی کے ساتھ پورا کر رہی ہیں۔ قارئین کی سہولتوں کا مزید خیال کرتے ہوئے کتابوں کی قیمت بہت کم رکھی جاتی ہے تاکہ کتاب زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچے اور وہ اس بیش بہا علمی خزانہ سے زیادہ سے زیادہ مستفید اور مستفیض ہوسکیں۔

یہ کتاب بھی بیورو کے اشاعتی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے کہ آپ کے علمی ادبی ذوق کے تسکین کا باعث بنے گی اور آپ کی ضرورت کو پورا کرے گی۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
ڈائریکٹر ترقی اردو بیورو

فہرست مضامین

تمہید

فلسفہ سیاسیات کی تاریخ میں میکیاولی مخصوص اور غیر معمولی شہرت و اہمیت کا مالک ہے۔ شاید ہی کسی دوسرے سیاسی مفکر یا مصنف کا نام اس قدر حقارت اور نفرت سے لیا جاتا ہو جتنا کہ "حکمراں" کے مصنف کا۔ جس شد و مد سے اس کے نظریات کی گذشتہ صدیوں میں تردید یا تائید کی جاتی رہی ہے، وہ حیرت انگیز ہے۔ اگرچہ اپنی تصانیف میں میکیاولی نے طرزِ حکومت کی تفصیلات سے بحث کی ہے اور مملکت کی تشریح پر زیادہ توجہ نہ دی پھر بھی وہ یعنی "مقالات" (The Discourses) اور "حکمراں" (The Prince) کا مصنف دنیا کے لیے ایک معمہ بن گیا۔ اس کے متعلق جن مختلف اور متضاد خیالات کا اب تک اظہار ہوا ہے تعجب انگیز ہیں۔ کسی نے کہا کہ میکیاولی مکر و فریب کا پیغمبر ہے تو کسی نے اسے دانتے (Dante) اور میزینی (Mazzini) کے ہم پلہ محبِ وطن اور اطالوی اتحاد کا علم بردار قرار دیا۔ اگر ایک طرف اس کو شاہی استبداد و جبر کا حامی اور "حکمراں" کو نا انصافی کی مجنونانہ تائید اور مطلق العنانی کا آلہ ٹھہرایا جاتا ہے تو اس کے بالکل برعکس یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ جمہوریت اور قومی آزادی کا اولین نقیب تھا۔ اور "حکمراں" میں اس نے شاہی جبر و استبداد پر طنز کیا اور مقالات میں مطلق العنانی کے خلاف انقلابی تحریک کو ہوا دی۔ اگر ایک مصنف اس کے نظریات کو مہمل و لایعنی اور شیطانیت کے مترادف گردانتا ہے تو دوسرا اسے فلسفۂ سیاست کا امام تسلیم کرتا ہے جس نے سیاست کو مذہبی قیود و سلاسل سے آزاد کر کے علم سیاست کے جسم نیم مردہ میں نئی روح پھونکی۔

مثلاً رموزِ بےخودی میں میکیاولی کے متعلق علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

آں فلارنساوی باطل پرست
سرمۂ او دیدۂ مردم شکست
نسخۂ بہر شہنشاہاں نوشت
در گلِ ما دانۂ پیکار کشت
فطرت او سوئے ظلمت بردہ رخت
حق ز تیغ خامۂ او لخت لخت
بُت گری مانندِ آذر پیشہ اش
بست نقش تازۂ اندیشہ اش
مملکت را دینِ او معبود ساخت
فکرِ او مذموم را محمود ساخت

مگر علامہ اقبالؒ کے برعکس "حکمراں" اور "مقالات" کے مصنف کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے "نظریات سیاسیہ" کے مصنف پروفیسر ولیم آرچبالڈ ڈننگ (William Archbold Dunning) نے لکھا کہ میکیاولی کے فلسفہ کی نوعیت اور اس کے طریق کا کوئی نمونہ ارسطو (Aristotle) کے بعد نہیں ملتا، اور ارسطو بھی یونان قدیم کا نہ کہ مسیحی یورپ کا، اس نے اپنے تخمین وتخیل میں متکلموں اور مقننوں کے تمام ذخیرے سے منہ پھیر لیا تھا، مثلاً "حکمراں" (The Prince) کے ابواب کے عنوانات کا مقابلہ اگر روسیلنس کے "حکمرانی" (Monarchia) کے ابواب سے کیا جائے تو مشکل ہی سے یہ خیال ذہن میں آنے لگا کہ دونوں مصنف ایک ہی دنیا میں رہتے تھے. حالانکہ روسیلنس نے صرف پچاس سال ہی قبل اس کو تصنیف کیا تھا، دو طاقتوں کا مسئلہ پوپ اور شہنشاہ کے تعلقات، روحانی اور دنیوی حدود و اختیار کا تصادم، مسلسل فرمانروائی کا اصول شاہ کانسٹینٹائن (Constantine) کے اصول اور اس طرح کے تمام عنوانات جو مدتوں سے چلے آرہے تھے، ان میں کسی کی جانب میکیاولی نے اشارہ تک نہیں کیا، آبائے کلیسا اور قرونِ وسطیٰ کے علمائی رایوں کا اس نے

حوالہ تک نہیں دیا اور مذہبی قانون یا قانون ملکی کی کسی عبارت کو وہ کبھی نقل نہیں کرتا، نظریہ سیاسی کے مدتوں کے مروجہ نظم سے اس کا کام ایسا ہی علیحدہ تھا جیسا اس زمانے میں کولمبس (Columbus) کا کام جغرافیہ کے مدتوں کے مقبولہ نظم سے علیحدہ تھا"

میکیاولی کے طریق انداز فکر اور اخلاقیات و مذہب کی جانب اس کی روش کے سلسلہ میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں ان کے باوجود یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ فکر و نظر کی جس بے باکی کا اظہار اس نے کیا، اور اپنے خیالات کی ادائیگی میں جس اعلیٰ عبارت آرائی سے اس نے کام لیا اس کی وجہ سے میکیاولی کو جو ہمہ گیر توجہ حاصل ہوئی وہ اس کا قرار واقعی مستحق تھا۔

میکیاولی کے مختصر حالاتِ زندگی

میکیاولی کی پیدائش ۱۴۶۹ء میں اطالیہ کے مشہور شہر فلورنس کے ایک متوسط مگر متمول اور عالی نسب خاندان میں ہوئی۔ اس کا باپ ایک اچھا خاصا کامیاب وکیل تھا۔ میکیاولی کے بچپن کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ اس کی تعلیم مروجہ نظام کے مطابق ہوئی تھی۔ لاطینی زبان میں اس نے کافی ملکہ حاصل کر لیا یونانی زبان سے بھی اسے تھوڑی بہت واقفیت تھی۔ اپنے زمانے کے کلاسیکی ادب سے بھی اسے خاصا لگاؤ تھا۔ اہل روم کی تاریخ، ان کے سیاسی اداروں اور نظریات کے بارے میں اس نے اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔ اس کے بچپن اور جوانی کے دور میں میڈیچی (The Medici) اپنے انتہائی عروج پر تھے۔ لیکن لورنزو (Lorenzo) کی موت کے بعد میڈیچیوں کا زوال ہو گیا اور فلورنس میں جمہوریت قائم ہو گئی۔ فلورنس کے اس جمہوری انقلاب سے میکیاولی کی عملی و سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ ۱۴۹۸ء میں وہ نئی حکومت میں مجلس دہ سری (Council of Ten) کا سکریٹری مقرر ہوا اور چودہ برس تک اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہا۔ اس مجلس یا شعبہ حکومت کے فرائض و اختیارات میں امورِ داخلہ و جنگ اور فوجی نظم و نسق شامل تھے۔ وہ فلورنس کے حکمراں خاندان ساڈرینی (Soderini) کا دوست تھا۔ خاندان جمہوری حکومت کے قیام کا خواہاں اور میڈیچیوں کی اشرافی حکومت اور ساوونارولا (Savonarola) کی انتہاپسندی دونوں کا مخالف تھا۔ اس برسرِ اقتدار خاندان سے اپنی دوستی اور قریبی تعلقات کے باعث میکیاولی متعدد بار غیر ملکی مذاکرات کے لیے فلورنس کا سفیر چنا گیا۔ اس طرح میکیاولی کا تعلق نہ صرف ملکی امور اور سیاست سے بلکہ خارجہ پالیسی اور بین الملکی سیاست سے بھی تھا۔

اپنے فرائض منصبی کو بجالانے کے سلسلہ میں اس کے لیے فطری اور لازمی تھا کہ وہ دوسری اطالوی اور غیر اطالوی ریاستوں کی سیاست سے کما حقہ واقفیت رکھے تاکہ فلورنس کی آزادی اور اس کے مفاد پر کسی طرف سے کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ اس طویل عرصہ میں اسے متعدد بار مختلف ملکوں کا سفر بھی کرنا پڑا

مثلاً ۱۵۰۰ء میں میکیاولی کو فرانس کے لوئی دوازدہم (Louis XII) کے حضور میں جانے کا موقع ملا، ۱۵۰۲ء میں سیزر بورجیا (Cesar Borgia) کی خدمت میں پہنچا، ۱۵۰۳ء میں اس نے پوپ پائیس سوم (Pius III) کے انتقال اور نئے پوپ کے انتخاب کے موقع پر روم کا سفر کیا، ۱۵۰۶ء میں اسے پوپ جولیس دوم (Julius II) سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس طرح اس نے فلورنس اور دوسرے ممالک کی سیاسی زندگی کا غائر مطالعہ کیا اور سولھویں صدی میں یورپ کی حکومتیں جن مسائل اور مشکلات، خانہ جنگیوں اور بغاوتوں سیاسی شورشوں اور بدامنیوں وغیرہ سے دوچار تھیں اور عملی سیاست میں جن قدروں یا اصولوں پر اس صدی کے حکمراں عمل پیرا تھے ان سب کا اسے ذاتی علم اور عملی تجربہ ہوا اور اس نے فکر و نظر پر گہرا اثر ڈالا۔

دریں اثنا میڈیچی فلورنس دوبارہ برسر اقتدار آنے کے لیے سازش کر رہے تھے بالآخر وہ ۱۵۱۲ء میں ساڈرینی خاندان کے تخت حکومت کو پلٹ کر اشراقی طرز کی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو کر رہے۔ اس انقلاب کے بعد میکیاولی کا خیال تھا کہ وہ اپنے سرکاری عہدہ پر بدستور برقرار رہے گا کیوں کہ وہ خود کو ایک مستقل شہری ملازم (سول سرونٹ) تصور کرتا تھا۔ لیکن میڈیچیوں کو ساڈرینی خاندان والوں سے اس کے گہرے تعلقات کا بخوبی علم تھا چنانچہ اقتدار سنبھالنے کے تھوڑے عرصہ بعد ہی انہوں نے اس کی وفاداری اور غیر جانبداری کو مشکوک سمجھتے ہوئے اسے اس کے عہدہ سے برطرف کر دیا۔ پھر اس کے اوپر ایک سیاسی سازش میں ملوث ہونے کا الزام لگایا گیا اور کچھ دنوں اسے قید و بند کی سختیاں بھی جھیلنی پڑیں۔ آخر کار وہ بری کر دیا گیا۔ ۱۵۱۳ء میں میڈیچیوں کے اقتدار کو اس وقت چار چاند لگ گئے جب ایک میڈیچی یعنی لیو دہم ([illegible]) جولیس دوم ([illegible]) کا جانشین ہوا۔

۱۵۱۲ء سے ۱۵۲۶ء تک میکیاولی نے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی اور اس کا فلورنس کی حکومت و سیاست سے کوئی تعلق نہ رہا۔ وہ اپنے حال زار سے بہت کبیدہ خاطر تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اسے دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے لہذا اسے سابق حکمرانوں کے ساتھ دوستی کا خمیازہ نہیں بھگتنا چاہیے۔ اسے اپنی سیاسی جلاوطنی سے اس قدر کوفت تھی کہ اس نے اپنے سیاسی عہدہ کی بحالی کے لیے انتھک کوشش شروع کر دی۔ اور چاپلوسی اور خوشامد کے ذریعہ میڈیچیوں کو اپنی لیاقت اور انتظامی صلاحیت کا قائل کرنے میں لگا رہا۔

ان کوششوں کے ساتھ میکیاولی نے وقت گذاری کے لیے ادبی اور علمی مشغلوں کا بھی سہارا لیا۔ دورانِ ملازمت اس کے ذہن میں ایک ایسی کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا جس میں وہ سیاسی اقتدار کے حصول اور اس کو برقرار رکھنے کے اصولوں سے بحث کرے۔

سیزر بورجیا (Cesar Borgia) کے دربار میں اگرچہ اسے ایک مختصر مدت کے لیے حاضر ہونے کا موقع ملا تھا لیکن اسی عرصہ میں وہ اس جوان سال سیزر کی اپنے مقاصد کو نہایت بردباری اور زیرکی سے حاصل کرنے کی لیاقت کا مداح ہو گیا تھا۔ اور اس نے یہ رائے قایم کی کہ دوسرے حکمرانوں کے بالکل برعکس سیزر بخوبی جانتا تھا کہ طاقت کو کس موقع پر استعمال کرنا چاہیے اور رعایا کی خوشنودی کب حاصل کرنی چاہیے۔ جلاوطنی کے دوران اس کے غور و فکر کا نتیجہ "حکمران" ([illegible]) اور "مقالات" (D[illegible]) ([illegible] Livius) کی شکل میں نکلا۔ ان تصانیف میں اس نے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ مختلف حکومتوں کو مختلف سماجی اور اخلاقی حالات کے تحت کس قدر کام کرنا چاہیے۔ دریں اثنا میکیاولی کی میڈیچیوں کو رام کرنے کی کوشش کچھ بار آور ہوئی۔ کیونکہ انہوں نے خوش ہو کر اسے "فلورنس کی تاریخ" (History of florence) لکھنے کے کام پر مامور کر دیا اس تصنیف میں میکیاولی کو خود اپنے شہر کی سیاست کے

تجزیہ میں اپنے ذاتی نظریات کے اطلاق کا موقع ملا۔

اس تاریخ کا لب لباب یہ ہے کہ سیاست میں چرچ اور پوپ کی مداخلت کے سبب اطالیہ کی وحدت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ پاپاؤں نے اپنے اقتدار اور اپنی سیاسی مصلحتوں کی خاطر غیر ممالک کو مداخلت کی دعوت دے کر اطالیہ کو سیاسی انتشار اور طوائف الملوکی کی لعنتوں سے دوچار کیا۔ اپنی پوزیشن اور اثرات کو برقرار رکھنے کے لیے وہ ہر اس تحریک اور ہر اس حکمراں کے مخالف رہے جس کا نصب العین اطالیہ کا قومی اتحاد اور سیاسی آزادی تھا۔ رسالہ "فنِ جنگ" ۱۵۲۰ء The Art of War میں اس نے حرب و ضرب کے جملہ مسائل سے بحث کی اور انہیں خیالات کا اعادہ کیا جن کا اظہار وہ "حکمراں" میں کرچکا تھا یعنی اپنے ملک کی حفاظت ہر شہری کا فریضہ ہے۔ کرائے کے سپاہی بیکار ہوتے ہیں اور خطرناک بھی۔

اس کے علاوہ میکیاولی نے "مندراگولا" (Mandragola) کے عنوان سے ایک منظوم مزاحیہ ڈرامہ بھی سپردِ قلم کیا جس میں اس نے سولہویں صدی کے اطالیہ کی سماجی زندگی اور اخلاق و کردار کی خامیوں کا نہایت کامیاب نقشہ پیش کیا ہے۔ اہلِ کلیسا حتیٰ کہ خود پاپاؤں نے اپنی ذاتی اغراض کے لیے جس طرح اخلاقی اور مذہبی احکام و قیود کو پس پشت ڈالا اس میں اس پر بھی بھرپور طنز کیا گیا ہے۔

لیکن تصنیف و تالیف میں اس کا جی مستقل طور سے نہیں لگ سکتا تھا کیونکہ یہ مشغلہ اس نے اپنی سیاسی جلاوطنی کے دوران بیکاری سے محض چھٹکارا پانے کی خاطر اختیار کیا تھا۔ ۱۵۲۱ء میں جب اس نے یہ محسوس کیا کہ میڈیچی اس سے خوش نظر آتے ہیں تو اس نے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ کارڈنل گیولیوڈی میڈیچی (Cardinal Giulio de' Medici) (مستقبل کے پوپ کلیمنٹ ہفتم) نے پراٹیکا کی مجلسِ ہشت سری (Council of Eight of Pratica) سے یہ سفارش کی کہ فرانسسکن پادریوں کے اجتماعِ عام (General Chapter of the Franciscans) میں سرکاری نمائندہ کے طور پر میکیاولی کو بھیجا جائے۔ چونکہ میکیاولی پادریوں کا سخت مخالف تھا لہٰذا اولاً اس نے اس مشن کا مذاق اڑایا۔ لیکن پھر اس توقع میں اسے قبول کرلیا کہ شاید یہ مشن اس کے

سیاسی عہدہ کی بحالی کا پیش خیمہ بن جائے۔ اس ستم ظریفی کے بعد "حکمراں" کے مصنف کے ساتھ دوسری ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اس مشن کی تکمیل کے کچھ ہی دنوں بعد پشمینہ بافوں کی انجمن (The Wool Guild) نے اس کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ ان کے لیے کوئی مناسب پادری فراہم کرے۔

۱۵۲۶ء کے موسم بہار تک میڈیچی اس کے کاموں سے اس قدر مطمئن ہو چکے تھے کہ انہوں نے بالآخر اُسے "شہر کی فصیلوں کے نگہبانوں کے سکریٹری (Secretary to the superintendents of the walls) کا اہم منصب عطا کیا۔ اس حیثیت سے وہ فلورنس کے نمائندہ کے طور پر اتحادی فوج میں پوپ کے قائم مقام سے گفت و شنید کے لیے بھیجا گیا جو شہنشاہ شارل پنجم (Emperor Charles V) کے امکانی حملہ کو روکنے کے لیے اکٹھا کی گئی تھی۔ اس شہنشاہ نے ایک بڑی فوج کے ساتھ اطالیہ پر حملہ کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اس کی مزاحمت کے لیے دوسرے شہروں کے ساتھ فلورنس بھی پوپ کی حمایت میں صف آرا ہوا تھا۔ لیکن اگلے سال یعنی ۱۵۲۷ء کے موسم بہار تک بھی شہنشاہ مخالف اتحادی فوج کارروائی کے قابل نہیں ہو سکی تھی جبکہ شہنشاہ کی فوج اطالیہ کے شمالی علاقہ میں داخل ہو چکی تھی۔ میکیاولی نے ایک بار پھر اپنی آنکھوں سے اطالیہ کے حکمرانوں کی نااہلی اور گوسفندی کا مشاہدہ کیا اور اسے یقین ہو گیا کہ اطالیہ کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

شہنشاہ کی فوج تیزی سے حرکت کرتی ہوئی اور کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر چھ مئی کو شہرِ روم میں داخل ہو گئی۔ شارل کے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں فرقوں کے سپاہیوں نے مقدس پاپائی شہر کو بری طرح پامال اور تاراج کیا۔ روم کے سقوط کا فلورنس کی سیاست پر آناً فاناً ردعمل ہوا۔ چونکہ شکست خوردہ پوپ (کلیمنٹ ہفتم) خود میڈیچی خاندان کا تھا اس لیے جب روم کی شکست کی خبر فلورنس پہنچی تو جمہوریت پسند طاقتوں کی ہمت بڑھی اور انہوں نے چشم زدن میں میڈیچیوں کے خلاف انقلاب برپا کر کے انہیں جلاوطن کر دیا۔ اور پھر سے جمہوری حکومت قائم کی۔

اس مرحلہ پر میکیاولی کے ساتھ آخری ستم ظریفی یہ ہوئی کہ وہ میڈیچیوں سے بہت قریب ہونے کے الزام میں "فصیلوں کے نگہبانوں کے سکریٹری" کے عہدہ سے برطرف کر دیا گیا۔ اس حادثہ کا میکیاولی کے ذہن پر کیا اثر ہوا ہوگا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن وہ اب اپنے تاثرات کسی نئی جلا وطنی کے دوران سپردِ قلم نہیں کر سکا کیونکہ وہ ۲۲ جون ۱۵۲۷ء کو اس دنیا سے چل بسا۔

میکیاولی کی شخصیت اور تعلیمات و نظریات کے سلسلہ میں جو شدید اختلافِ رائے ہے اس سے اس کی شخصیت کی حیرت انگیز یا عجیب و غریب شخصیت کے ہونے میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن یہ شدید اختلاف اس لحاظ سے اور بھی تعجب خیز ہے کہ بہ حیثیت نثر نگار میکیاولی اطالوی ادب میں ایک ممتاز حیثیت کا مالک ہے۔ وہ ایک صاحبِ طرز ادیب تھا جس کی زبان میں سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ زورِ کلام بھی ہے۔ اس کا طرزِ تحریر نہایت شستہ و مدلل اور عبارت آرائی سے پاک ہے۔ ہیگل (He-el) کی طرح اس کی عبارت دشوار اور پر پیچ نہیں کہ پڑھنے والا لفظوں کے جال میں الجھ کر رہ جائے اور ساری عبارت معمہ نظر آنے لگے۔ وہ جو کچھ بھی کہنا چاہتا ہے اس کو حد درجہ صاف سادہ الفاظ میں بیان کر دیتا ہے اور پڑھنے والا کوئی الجھن محسوس نہیں کرتا۔ اس طرح وہ اپنے اُن خیالات اور نظریات کے اظہار کے لیے جو مروجہ مسلمات و معتقدات سے نہ صرف مختلف بلکہ ان کی ضد تھے استعاروں اور مبہم اور ذومعنی الفاظ کی آڑ نہیں لیتا بلکہ تالی راں (Tal-[illegible])

کے برخلاف اپنے مافی الضمیر یا مفہوم کی ادائگی میں نہایت نڈر، بے باک اور کسی حد تک گستاخ بھی ہے۔ اس لیے بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ میکیاولی کی شخصیت اور اس کی تعلیمات ہمارے لیے ایک معمہ بن جائیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار کون کر سکتا ہے کہ چار سو برس کا طویل عرصہ گذر جانے کے بعد بھی میکیاولی آج تک ایک معمہ ہے جس کی تعلیمات و نظریات کے بارے میں مفکرین و مورخین کے درمیان شدید اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

میکیاولی نہایت ہی ذہین، طباع اور روشن دماغ ضرور تھا۔ وہ نہ صرف مؤرخ و مفکر تھا بلکہ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے ڈرامہ نویس اور ڈپلومیٹ بھی تھا۔

مزید برآں آسے فوجی تربیت و تنظیم سے بھی خاص شغف تھا اور وہ ایک ایسا مورخ ہے جس نے اپنی حب الوطنی کا ثبوت میدانِ جنگ میں نہایت جواں مردی سے دیا تھا۔ انہیں سب وجوہ کی بنا پر میکیاولی کو یہ موقع ملا کہ وہ مختلف حیثیتوں اور مختلف زاویوں سے اپنے زمانہ کے سیاسی حالات کا بہ نظرِ غائر مطالعہ و تجزیہ کر سکے اس کا علم صرف کتابوں ہی تک محدود نہ تھا بلکہ اس کی معلومات اور تجربات کا دائرہ بہت وسیع تھا جس میں رزم و بزم، محفلِ رباب و چنگ، علم و عمل سبھی کچھ شامل تھے۔ اس لیے اس نے نہ صرف ان حالات کا مطالعہ کیا بلکہ وقت کے تقاضوں کی نباضی بھی کی۔ اور غالبًا یہ اس کا سب سے بڑا قصور رہے کہ اس نے اپنے مشاہدات اور نظریات کو نہایت صفائی اور بے باکی سے پیش کر دیا۔ لیکن جس دور کا وہ ترجمان ہے وہ ایک انقلابی دور تھا، نہایت ہی پیچیدہ اور بڑے اختلافات، مشکلات اور تضاد کا دور۔ لہذا میکیاولی کی تعلیم اور نظریات کو اس دور کے سیاسی حالات اور مذہبی ماحول اور تمدنی رجحانات سے جدا نہیں کیا جا سکتا، بالخصوص نشاۃ ثانیہ (Renai ssance)

اور پروٹسٹنٹ مذہبی اصلاح (Protestent Reformation) کی انقلابی تحریکوں اور ان کے ہمہ گیر اثرات کا تاثر میکیاولی کی تحریروں میں نمایاں ہے۔

۲۔میکیاولی: نشاۃ ثانیہ کا فرزند

یورپ میں عصر جدید کی ابتدا نشاۃ ثانیہ (Renaissance) مذہبی اصلاح (Reformation) تحریکوں سے ہوئی۔ مذہبی اصلاح یا ریفرمیشن ایک مذہبی تحریک تھی جس کا مقصد کلیسا کی خامیوں اور عیوب کو دور کرنا، پوپ کی سیاست اور اقتدار کو ختم کرنا اور مسیحی مذہب کا اصل رنگ اور روپ بحال کرنا تھا۔ ریفرمیشن کے برعکس نشاۃِ ثانیہ کی تحریک میں لامذہبیت کا عنصر موجود تھا کیونکہ اس کا سرچشمہ یونانی فلسفہ اور آرٹ تھا۔ ترکوں کی فتوحات اور خصوصاً قسطنطنیہ کی تسخیر کے نتیجہ میں یونان کے اہل علم نے اطالیہ میں پناہ لی تھی۔ اطالیہ اور خاص کر فلورنس (Florence) نے ان جلا وطنوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور سر آنکھوں پر بٹھایا۔ اہالیانِ فلورنس نے اور خصوصاً وہاں کے تاجروں اور دولت مندوں نے یونانی علوم و فنون کی قدر دانی میں جو گرم جوشی دکھائی اس کا بہترین نقشہ انگریز مورخ رچرڈ گرین (Richard Green) نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے :-

"فلورنس جو اب تک آزادی و صنعت کا مرکز رہا تھا اب علمی تجدید کا بھی مرکز بن گیا۔ ہومر (Homer) کی شاعری، سوفوکلیس (Sophocles) کا ڈراما، اور ارسطو و افلاطون کا فلسفہ، اس عظیم الشان گنبد کے سایہ میں پھر جاگ اٹھا جسے برونیلیشی (Brunelleschi) نے حال ہی میں دریائے ارنو (Arno) کے قریب فلورنس میں تیار کیا تھا اور جو تمام شہروں کی عمارتوں کا سرتاج تھا۔ فلورنس نے اب اپنی تمام قوت علم کی حمایت میں لگا دی تھی۔ اس کے سوداگروں کے جہاز مشرق سے قلمی کتابیں لاتے تھے اور ان کے

تمام ذخائر میں یہی کتابیں سب سے زیادہ قیمتی سمجھی جاتی تھیں۔ اس کے امرار کے محلات میں گرلاندیو (Ghirlandajo) کی پچی کاری کیے طاقچوں (Frescoes) کے اندر قدیم زمانہ کے مجسمات کے ٹکڑے سجائے جاتے تھے۔ سسرو (Cicero) کی کوئی کتاب۔ سیلسٹ (Sallist) کا کوئی رسالہ کسی خانقاہ میں دبا دبایا مل جایا کرتا تھا تو فلورنس کے مدبر اور اہلِ فن، روچیلائی (Ruccelli) کے باغات میں جمع ہوکر نہایت جوش کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتے تھے"۔

اس طرح اطالویوں کی علم نوازی اور یونانی علمار کی قدر و سرپرستی سے مغربی یورپ کے لیے علوم و فنون اور شعر و سخن کے وہ خزانے کھل گئے جو صدیوں سے مسدود تھے۔ اب یونان کی علمی کتب کا براہ راست مطالعہ شروع ہوگیا۔ اور اب اس کی ضرورت باقی نہ رہی کہ افلاطون اور ارسطو کی تعلیمات کو ترجموں اور حاشیوں کی مدد سے پڑھا جائے۔ یونان کے علم کی قدر و منزلت کا اندازہ ہمیں اراسمس (Erasmus) کے اس خط سے بخوبی ہو سکتا ہے جس نے پیرس سے لکھا تھا کہ "میں نے یونانی علوم کے حاصل کرنے میں اپنی جان تک کھپا دی ہے اور جس وقت بھی کچھ روپیہ میرے ہاتھ آئے گا میں پہلے یونانی کتابیں خریدونگا بعد میں اپنے لیے کوئی کپڑا لوں گا"۔ اور بقول گرین "طلبہ، یونانی علم و ادب حاصل کرنے کے لیے راتوں کا جاگنا، بھوکا رہنا، اور ہر طرح کی زحمت گوارا کرتے تھے"۔ اس نئی تحریک کا اثر صرف تعلیمی اداروں کی دیواروں یا روشن خیال حضرات کی مجلسوں تک ہی محدود نہ تھا۔ چھاپہ خانوں کی وجہ سے نصف صدی کی قلیل مدت میں یعنی ۱۴۷۰ء سے ۱۵۲۰ء تک تمام قابلِ قدر لاطینی اور یونانی مصنفین کی کتابیں شائع ہوکر علوم و فنون کے قدر دانوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی تھیں۔ اس طرح عہد قدیم کے وہ بیش بہا مخطوطات جو اب تک پڑے سڑ رہے تھے شائقین علم و فنون کے ہاتھوں تک پہنچ گئے اور ادبیات عالیہ کے درس کا رواج عام ہوگیا۔ کلاسیکی ادب اور تاریخ کے مطالعہ نے اقوام یورپ کو یونان اور روم کے محیر العقول کارناموں اور ان کی تہذیب و تمدن سے روشناس کرایا۔ اور بالخصوص

ایتھنز (athens) کی متمدن سیاست اور اس کے ان قوانین، رسوم و رواج اور سیاسی نظریات اور فلسفہ سے از سر نو کا حقہ رُوشناس کرایا جن کی بنا پر اہلِ یونان اپنے ماسوا جملہ اقوام عالم کو غیر متمدن اور وحشی گردانتے تھے ایتھنز "یونان کی تعلیم گاہ" بنا ہوا تھا۔ یہ وہی ایتھنز تھا جس کی ملٹن جیسے یورپین شاعر نے بھی مداح سرائی کی تھی اور جسے "یونان کی آنکھ" کہہ کر سراہا تھا۔ یونانی اور لاطینی مفکروں کی تعلیما اور کلاسیکی ادبیات کے مطالعے نے ذہنی قوتوں کو از سر نو بیدار کر کے فکر و نظر کو ایک نئی وسعت بخشی اور لوگوں کو مظاہر فطرت کے مطالعہ کی طرف متوجہ کیا۔ اور روشن دماغ اشخاص اس بات پر زور دینے لگے کہ فطرت اور مظاہر فطرت کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کیا جائے۔ کیونکہ بقول روجر بیکن (Roger Bacon) "اس طریق سے انسان، فطرت کی باریکیوں اور کارفرمائیوں کے اسرار سے کا حقہ واقف ہو سکتا ہے۔ اور ان رازوں سے واقف ہو کر ہی انسان فطرت کا مقابلہ کر سکتا ہے۔" تحقیق اور تجسس کے اس نئے جذبے نے یورپ کی تاریخ میں ایک عظیم الشان اور زریں باب کا اضافہ کیا۔ احیائے علمی کے دور میں تحقیق و تفتیش کا جو ذوق و شوق پیدا ہوا تھا اس کا بہترین اظہار فرانسس بیکن (Francis Bacon) کی معرکۃ الآرا تصنیف "فلسفہ کی تجدید عظیم" کے سرورق سے ہوتا ہے۔ سرورق پر ایک جہاز کی تصویر دی ہوئی ہے جو اپنے بادبان اٹھائے، آب نائے جبل الطارق سے گزر کر مغربی سمندروں کی طرف تحقیق کے لیے جا رہا ہے۔ قدیم ادبیات کے عظیم الشان اثرات کی تصویر موسیو تین نے ان مختصر مگر جامع الفاظ میں کھینچی: "لوگوں نے پہلی بار آنکھیں کھولیں اور دیکھا جو دیکھا"

نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے زیر اثر افراد میں آزادانہ مطالعہ اور مظاہر فطرت کی تحقیق و تجسس کا جو ذوق و شوق پیدا ہوا اس نے انفرادی آزادی کا مطالبہ کیا۔ لیکن بقول پروفیسر کلیمنٹ ویب (Clement Webb) "اس وقت وہ یعنی خرد گذشتہ زمانہ کی طرح اس لیے آزادی کا طالب نہ تھا کہ اپنے باطن کی طرف نظر ڈالے اور اپنے دل کے رازوں پر غور کرے بلکہ اس لیے آزادی کا طالب تھا کہ گرد و پیش کی چیزوں پر نظر ڈالے اور ان "طبیات" سے بہرہ اندوز ہو جو قدرت نے اس

کے لیے مہیا کی ہیں۔ کیونکہ اس وقت جدید یورپ کے سنِ بلوغ کے زمانے میں اس کے سامنے ایسی دنیا آرہی تھی جو اس کے عالمِ طفولیت کی دنیا کے مقابلہ میں وسیع تر افق اور بیش تر اسباب عیش رکھتی تھی۔ اس وقت اس میں شریکِ عمل ہونا اور اس کے خیر و شر کے خطرات کو برداشت کرنا ہر انسان کا فرض معلوم ہوتا تھا۔ اور اس سے اعراض و گریز کر کے خانقاہ کے حجرہ میں پناہ لینا بزدلی اور ناشکری معلوم ہوتی تھی۔"

نشاۃ ثانیہ کا اثر صرف علما اور علمی دنیا تک ہی محدود و مخصوص نہ تھا بلکہ یہ ایک ہمہ گیر تحریک تھی جس نے نہ صرف یورپ کے سیاسی حالات اور ذہنی رجحانات کی کایا پلٹ کی بلکہ عوام کی روزمرہ زندگی کو ایک نئی وسعت اور ان کے تخیل کو ایک نئی رفعت بخشی۔ افلاطون اور ارسطو کی تعلیمات، کلاسیکی ادب کے مطالعہ اور اہلِ یونان و روما کے شاندار سیاسی کارناموں سے واقفیت سیاسی خیال آرائیوں کی ترغیب و تحریک کی باعث ہوئی اور انسانی زندگی کی حقیقی قدر و قیمت کا اب انہیں صحیح اندازہ ہوا۔ قرونِ وسطیٰ میں یہ نظریہ بلکہ عقیدہ عام تھا کہ حقیقی معنوں میں دنیا کی تاریخ حضرتِ عیسیٰ کی پیدائش اور بعثت سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے قبل جاہلیت کا دور دورہ تھا اور مسیحی دنیا کے لیے یونانیوں اور رومیوں کی عظمت کا زمانہ لایعنی اور عملاً بے کار ہے۔ کیونکہ خدائی الہام سے فیض یاب ہونے کی وجہ سے وہ لوگ صحیح معرفت و بصیرت سے محروم رہے تھے نشاۃ الثانیہ نے اس نظریہ کی تردید کی اور اقوامِ یورپ کو یونانیوں اور رومیوں کی محیر العقول عظمتِ گذشتہ سے از سرِ نو روشناس کرایا۔ وہ اب اس پر مجبور ہوئے کہ مملکت کی حقیقت حکومت کے کاروبار اور ملکی و قومی فرائض و حقوق کے مسئلوں پر غور و فکر کریں۔ مملکت کی تشریح اور اس کا نصب العین متعین کرنے کے سلسلہ میں یہ ناممکن تھا کہ جدید یورپ اس سیاسی نصب العین اور ان اخلاقی اقدار سے متاثر نہ ہوتا جو قدیم یونان اور بالخصوص ایتھنز کی شہری زندگی کی طرۂ امتیاز تھیں اور جن کی بنا پر سقراط نے ایتھنز کی آغوشِ لحد کو جلا وطنی کی زندگی پر ترجیح دی تھی اور جن کی وضاحت فارقلیس (Pericles) نے اپنی معرکۃ الآرا تقریر میں کی تھی جو اس نے خطبۂ موت (Funeral Oration)

کے سلسلہ میں سرامی کس (Ceramicus) کے گورستان میں کی تھی۔ یہ تقریر نہ صرف خطابت کا ایک اعلیٰ شاہکار ہے بلکہ مملکت کی تشریح، حکومت کے فرائض اور جمہوری نصب العین کی جو تعریف اور وضاحت اس تقریر میں ہے وہ عدیم المثال ہے جرأت و بلند حوصلگی اور انسانی زندگی کی عظمت و وقعت کا جو نظریہ فارقلیس نے اس تقریر میں پیش کیا ہے اس سے ہم آج بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

"ہمارے آئین و قوانین، ہماری سیاسی مجلسیں اور انجمنیں ایسی نہیں جو دوسروں کی نقل ہوں وہ ہماری اپنی ہیں۔ اور مدبرانِ ایتھنز کی خاص ایجاد ہیں۔ موجودہ مصطلحات سیاست میں ہمارے طرز حکومت "کو ڈیموکریسی" (جمہوریت) کہا جاتا ہے۔ یہ نام صحیح بھی ہے اور غلط بھی۔ صحیح اس معنی میں کہ ہمارے شہر اور سلطنت کا تمام انتظام عوام کے ہاتھ میں ہے۔ اس میں امیر ہو یا غریب ہمارے یہاں سب کے لیے ایک ہی قانون ہے۔ غلط اس معنوں میں کہ تمام متعلقہ ریاستوں پر عوام کو ایک فضیلت و سرداری کا دعویٰ ہے۔ اس معنی میں ہماری حکومت "ارسٹوکریسی،، (حکومتِ شرفا یا امراء) ہے۔ لیکن اس ارسٹوکریسی کے ارکان یعنی شرفا یا امراء جو کچھ اختیارات حقوق رکھتے ہیں اس وجہ سے نہیں رکھتے کہ وہ اعلیٰ نسب ہیں کیونکہ ہم نسبی مراعات وحقوق کو جائز نہیں سمجھتے اور نہ ان امراء کو یہ حقوق و اختیارات اس لیے حاصل ہیں کہ وہ بڑے دولت مند ہیں کیونکہ مفلسی ہمارے یہاں حقوق و اختیارات میں مانع نہیں ہے۔ بلکہ وہ امراء اس لیے کہے گئے کہ ان کی امارت محض ان کی ذاتی لیاقت پر منحصر ہے اس لیے ہماری ارسٹوکریسی وہ ہے جس میں ہر شخص اپنی سلطنت کو فائدہ پہنچانے کی قابلیت رکھتا ہے اور وہ اس کا مستحق سمجھا جاتا ہے کہ بلا مزاحمت اپنی سلطنت کو فائدہ پہنچائے یہی اصلی آزادی اور حقیقی حریت ہماری سیاسی زندگی کی بنیاد ہے۔ اور اس طرح ہم اپنی معاشرت اور سوسائٹی میں قیدوں سے آزاد ہیں۔ ہر شخص آزاد ہے کہ جو کام یا پیشہ چاہے اختیار کرے۔ اس میں نہ اس کی کوئی ذلت سمجھی گئی ہے اور نہ کوئی بدگمانی اس کی جانب سے پیدا ہو سکتی ہے۔ ہماری عادت کے خلاف ہے کہ کسی ایک ہی طریقہ کے غلام ہو جائیں۔ یا پھر اپنے ارد گرد ایک حلقہ تیار کریں جس میں کسی دوسرے کو نہ آنے دیں یا ہم کسی شخص کو اس وجہ سے کہ اس کا طریق کار ہم سے جدا ہے اپنے حلقۂ صحبت

سے جدا نہیں رکھتے۔ ہم اپنے بزرگوں کا پاس ادب اور ہر متبرک شے کو تعظیم کی نظر سے دیکھنے کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں۔ اور یہی وہ چیز ہے جو ہمارے ہر فعل وعمل میں جاری وساری ہے۔ ہماری ہر تقریب وانجمن میں ہماری شہری زندگی کا جزو اعظم پوشیدہ ہے۔ حاکم کی حکومت کے سامنے ہماری گردنیں خم رہتی ہیں۔ قانون کی پابندی کو اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں، سزا کے خوف سے نہیں بلکہ اس کو اپنی زندگی کا اصول سمجھ کر، تمام احکام میں سب سے بڑھ کر جس حکم کی وقعت ہمارے دل میں ہے وہ یہ کہ ایسے زیر دستوں کو پناہ دیں جو زبردستوں سے مقابلہ کرنے سے معذور ہیں۔ ہمارے یہاں ایسے قوانین بھی ہیں جو کبھی ضبط تحریر میں نہیں آئے اور نہ کسی قانونی سزا یا تدارک کے ساتھ نافذ ہوئے مگر باوجود اس کے جو شخص بھی اس کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ مستوجب ملامت ونفرین سمجھا جاتا ہے۔

"ہم لوگ ارادہ بھی رکھتے ہیں اور عمل بھی۔ ملک کے لیے زندگی وقف کر کے جینا ہماری اصلی زندگی ہے، ہم ایک ایسی زندگی حاصل کرنا چاہتے ہیں جو اپنی تمام دلفریبیوں کے باوجود اسراف سے پاک ہو۔ ہم غور وخوض کا مادہ پیدا کرنا چاہتے ہیں لیکن انسانیت سے باہر نہیں ہونا چاہتے۔ ہماری نگاہ میں دولت ظاہری آرائش کے لیے نہیں ہے بلکہ معقول استعمال کے لیے، غربت کا اعتراف کرنا ہمارے لیے ذلت نہیں ہے بلکہ اس کے دفعیہ کی کوشش نہ کرنا بے شک ذلت ہے۔

یونان اور روما کے مفکروں کے مطالعہ اور کلاسیکی ادبیات کی درس وتدریس نے پندرھویں اور سولہویں صدی کے یورپ کو پرانی سیاسی قدروں مثلاً انفرادی آزادی، حب الوطنی، قومی آزادی اور رموزِ سیاست سے روشناس کرایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی آزاد خیالی اور اخلاقیات میں دوبارہ وہ لچک پیدا ہوئی جو یونان وروم کے غیر مذہبی تمدن کا طرۂ امتیاز تھی۔ کیونکہ جہاں تک مفکرین یونان وروم کے غور وفکر اور نقطۂ نگاہ کا تعلق ہے وہ خالص لادینی (secular) ہے۔ ان کے فلسفہ اور آئین وقوانین کے مطابق انسان سے مافوق اور اس دنیا سے ماوراء کوئی ایسا علم وہدایت ذریعہ اور سرچشمہ نہیں جس سے وہ اپنی تہذیب وتمدن اپنی سوسائٹی اور اپنی سیاست کے لیے قانون یا ہدایت حاصل کر سکتے۔ صحیح

اور غلط، مفید اور مضر کا فیصلہ اعمال کے ان نتائج سے ہی اخذ کیا جا سکتا ہے جو دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔ خدا کے ہونے یا نہ ہونے کا انسان کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں اور اس لیے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے انسان آزاد ہے کہ وہ اپنی سمجھ اور بساط کے مطابق ذرائع اور طریقے اختیار کرے۔

بقول تاریخ اخلاق یورپ کے مصنف ایڈورڈ ہارٹ پول لیکی (E.H.P. Lecrey) "یونانی تحریک تمام تر عقلی اور دماغی تھی بہ خلاف اس کے قدیم مصری تحریک یکسر روحانی و باطنی تھی" رومی مصنف آپولیس (Apul-eius) کا یہ قول نقل کرتے ہوئے کہ "مصری دیوتاؤں کی عزت آہ وزاری سے تھی اور یونانی دیوتاؤں کی رقص و سرود سے" لیکی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "اس میں شبہ نہیں کہ اس مقولہ کے آخری جز کی تصدیق تاریخ یونان میں قدم قدم پر ہوتی، درحقیقت کسی مذہب کے رسوم میں جشن، کھیل اور تماشوں کی اتنی آمیزش نہیں پائی جاتی جتنی اس میں، اور نہ کسی مذہب میں خوف و دہشت کا عنصر اس قدر پایا جاتا ہے جتنا اس میں، اس مذہب میں خدا کا تقدس بس اسی درجہ کا تھا جتنا کسی بزرگ شخص کا ہوتا ہے۔ اور اسے چند معمولی رسوم کیساتھ یاد کرنا اس کی عظمت و تمجید کے لیے بالکل کافی تھا" چونکہ روما کی علمی پستی کی وجہ سے یونانی تمدن رومی تمدن پر غالب ہو گیا تھا اس لیے ہر شعبہ حیات میں" رومی بلا تکلف یونانیوں کی تقلید کرتے تھے اور اس تقلید پر فخر کرتے تھے"

اس طرح سے اہل روما میں بھی مذہب اور مذہبی اعمال و رسوم کا کوئی خاص احترام یا وقار نہ تھا، بلکہ ان میں تو طاقت کا احترام عبادت اور تقدیس کے درجہ تک پہنچ گیا تھا، مذہب کی بے توقیری کی وجہ سے بقول سسرو (Cicero) تھیٹروں میں ایسے اشعار پڑھے جاتے تھے کہ دیوتاؤں کا دنیا کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں تو لوگ انہیں "ذوق و شوق" سے سنتے تھے۔ بقول سینٹ آگسٹائن (St. Augustine) رومن پرست مندروں میں تو دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے اور تھیٹروں میں ان کے ساتھ گستاخی اور تمسخر۔

کلید نقشہ

۱۔ نیپلز کی بادشاہت
۲۔ پاپائی مملکت
۳۔ سینا کی جمہوریہ
۴۔ فلورنس کی جمہوریہ
۵۔ لکسا کی جمہوریہ
۶۔ فرارا کی ڈچی
۷۔ مرانڈولا کی امارت
۸۔ مانتوا کی مارکیت
۹۔ وینس کی جمہوریہ
۱۰۔ میلان کی ڈچی
۱۱۔ جنوا کی جمہوریہ
۱۲۔ مانتفرات کی مارکیت
۱۳۔ آستی کی کاؤنٹی
۱۴۔ سوائے کی توری
۱۵۔ سالزو کی مارکیت

الغرض تحریک نشاۃ ثانیہ نے یورپ کے فکر و نظر کو جو نئی وسعت اور آزادی بخشی اس نے قرونِ وسطیٰ کی تہذیب اور تمدن پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اور ان خیالات و تعلقات نے زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا جو قرونِ وسطیٰ کی سیاسی و معاشرتی زندگی میں سنگ بنیاد کی سی حیثیت رکھتے تھے۔ نشاۃ ثانیہ نے یونان اور روم کے علوم و فنون سے پھر دلچسپی پیدا کر دی اور ان میں خوش و خرم زندگی بسر کرنے کا جذبہ ابھارا۔ صرف یہی نہیں بلکہ عالم فطرت کے تصور کو تبدیل کر دیا۔ یورپ کو ایک نیا سیاسی نظریہ دیا جو انفرادیت اور قومیت کے تصورات پر مبنی تھا۔ ایک نئی معاشرتی زندگی کو جنم دیا جس میں ربط و ضبط کی نئی صورتیں مثلاً شہری زندگی، دعوتیں اور جلسے اور رقص و سرود کی محفلیں وجود میں آئیں جن کا سلسلہ آج تک باقی ہے۔

سیاسی اور معاشرتی تغیرات کے ساتھ ساتھ اس تحریک نے اخلاق و مذہب اور اعمال و اعتقادات میں بھی تغیرات پیدا کئے۔ نئی تعلیمات اور نئی زندگی کے نئے تقاضوں کے زیر اثر کلیسا اور اس کے عائد کردہ مذہبی قیود کا احترام اٹھ گیا اور کلیسا کے بلند دعوں اور اس کے معتقدات کے خلاف اعتراضات اس کی طرف سے لاپرواہی کی دبا عام ہو گئی۔ بقول جانسن "صورت اور رنگ کی حسی مسرت نے بعض لوگوں کو شہواتِ نفسانی میں مبتلا کر دیا۔ دنیاوی اشیاء کے ساتھ نامناسب دل بستگی نے ایک دنیادارانہ غیر مسیحی روح پیدا کر دی اور انتقاد نے تشکیک و بے دینی۔"

نشاۃ ثانیہ کے خیالات و اثرات سے پوپ بھی محفوظ و مامون نہ رہ سکے تھے۔ اعمال و افعال اور سیرت و کردار کے لحاظ سے حضرت عیسیٰ کے جانشین اور کلیسا کے سربراہ اور دوسرے دنیاوی حکمرانوں میں کوئی خاص فرق و امتیاز باقی نہیں رہ گیا تھا۔ وہ اسی شان و شوکت سے رہتے، فوجیں رکھتے اور اپنے دشمنوں کے خلاف اسی طرح سے جنگ کرتے جس طرح کوئی دوسرا دنیاوی حکمراں۔ جنگ و جدل میں مصروف رہنے کی وجہ سے میکیاولی کے دو ہم عصر پوپ، الیگزانڈر ششم (۱۴۹۲ء-۱۵۰۳ء) اور جولیس دوم (۱۵۰۳ء-۱۵۱۳ء) جنگی پوپ کے لقب سے مشہور ہوئے کہا جاتا ہے کہ ان پاپاؤں کے اخراجات کے لیے مملکت فرانس کی پوری آمدنی بھی کافی نہ تھی، انوسینٹ ہشتم (Innocent VIII) نے تو اپنا پاپائی

تاج (Papal Crown) رہن رکھا تھا اور لیو دہم (Leo X) نے جس بے دردی یا دریا دلی سے دولت اڑائی اس کی مثال دنیوی حکمرانوں میں بھی مشکل سے ملے گی۔ اس نے نہ صرف اپنی دولت خرچ کی سابق پوپ کی چھوڑی ہوئی دولت کے علاوہ اُن رقومات کو بھی جو اس کے جانشین کے لیے وقف تھیں، پیشگی وصول کرکے خرچ کر ڈالا۔ معرکہ مذہب وسائنس (Conflict Between Religion and Science) کے فاضل مصنف ڈاکٹر جے ڈبلو ڈریپر (J.W. Draper) کے قول کے مطابق جب انوسینٹ چہارم (Innocent IV) نے مطالبہ کیا کہ کلیسائے انگلستان تین سو مزید اطالوی پادریوں کا متکفل ہو اور لنکن کے گرجا میں اس کا ایک بھتیجہ جو سنِ بلوغ کو بھی نہ پہنچا تھا ایک بڑی خدمت پر مامور کیا جائے تو معلوم ہوا کہ جو رقم پہلے ہی سے ہر سال غیر ملکی پادریوں پر صرف ہوتی تھی وہ اس رقم سے تین گنی تھی جو شاہی خزانہ میں داخل ہوتی تھی۔

ان ہی سب وجوہات اور سیاست وسیاسی سازشوں میں دلچسپی اور عملی حصہ لینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک طرف تو پوپ اور اہلِ کلیسا سے مذہبی فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی ہونے لگی اور دوسری طرف سیاسی مخاصمت نے ان کے مذہبی اقتدار کی مخالفت کے خیال وجذبہ کو اور ہوا دی۔

مزید برآں کلیسا کی مخالفت کے جذبہ کو عقلیت اور مذہب کی کشمکش نے اور بڑھاوا دیا کیونکہ محققین اور علماء طبیعیات نے کلیسا کے جغرافیہ، تاریخ اور طبیعیات کے بے اصل نظریات کے بے چون وچرا ماننے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ ان کی علمی تنقید کی اور تقلیدی زنجیروں سے بغاوت۔ اربابِ کلیسا نے اپنے اقتدار اور طاقت کو استعمال کرتے ہوئے تحقیق وعقلیت کی نئی لہر کی تکفیر کی اور احتساب کی عدالتیں (Inquisition) قائم کیں کہ وہ "ملاحدہ اور مرتدین کو سزا دیں جو شہروں، گھروں، تہ خانوں، جنگلوں، غاروں اور کھیتوں میں پھیلے ہوئے ہیں"

محکمہ احتساب نے جس مستعدی اور سرگرمی سے تفتیش اور تجسس کے فریضہ

کوانجام دیا اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس محکمہ نے تقریباً تین لاکھ افراد کو سزا دی جن میں سے بتیس ہزار 32,000 کو زندہ جلایا گیا تھا، انہیں سزا پانے والوں میں برونو (brunoe) اور گلیلیو (Galilio) تھے۔ برونو کا جرم یہ تھا کہ دوسری دنیاؤں اور آبادیوں کا قائل تھا جب کہ گلیلیو کا جرم یہ تھا کہ وہ آفتاب کے بجائے زمین کی گردش کا قائل تھا، اور یہ دونوں نظریے کلیسائی مفروضات اور تعلیمات کے منافی تھے، کلیسا کے تشدد اور جمہور اور محکمہ احتساب کے مظالم کے خلاف عام بیزاری اور بغاوت کی نشان دہی کرتے ہوئے ایک عیسائی عالم نے بجا کرب و ملال سے کہا کہ یہ ناممکن تھا کہ کوئی شخص عیسائی بھی ہو اور وہ بستر پر جان دے۔

اور اس طرح کلیسا کی اصلاح کا مطالبہ وقت کے ساتھ ساتھ شدت پکڑتا گیا، منصب پوپ اور اقتدار کلیسا کی طرف سے جو ایک عام بے چینی اور بد دلی پیدا ہو گئی تھی اسے آئیور تھیچر اور فرڈی نند شیول نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"پوپ کے دربار میں ایک بہت بڑی تعداد معتمدوں، محرروں، خادموں اور ملازموں کی رہتی تھی۔ مستقل فوج قائم تھی۔ عالی شان عمارتیں بن رہی تھیں۔ نقش و نگار، مجسمے اور دوسرے پسند خاطر نفیس کاموں کا سلسلہ جاری تھا۔ قلمی سودے اور کتابیں خریدی جا رہی تھیں ... حکومت کے اخراجات بھی بڑھے ہوتے تھے کیونکہ تمام حکومتوں سے پوپ کے تعلقات قائم تھے۔ ان سب ضروریات کے لیے ہر سال بے اندازہ رقم کی حاجت ہوتی تھی۔ پاپاؤں نے مختلف طریقوں اور مختلف ناموں سے ساری دنیا پر محصول لگا رکھا تھا" ..... اور روم کی طرف سونے چاندی کا سیلاب بہا چلا جا رہا تھا۔ جرمنی، فرانس اور انگلستان کے لوگ یہ سوال کرنے لگے تھے کہ پوپ کے اس سامان تعیش کے فراہم کرنے، اس کی فوج کو میدان جنگ میں قایم رکھنے اور اس کے صنعتی کاموں کے اخراجات ادا کرنے لیے ہم لوگوں پر کیوں محصول لگایا جائے" پاپاؤں اور پادریوں کے عیش و عشرت اور دنیا داری میں منہمک ہونے کی شکایت صرف عوام و خاص تک ہی محدود نہ تھی بلکہ خود کلیسا کے باکمال علماء اور سنجیدہ دماغوں کو بھی اس بات کا شدید احساس تھا کہ پوپ اور پادریوں کا

طرزِ زندگی ان کی اخلاقی پستی اور ان کی اپنے فرائض کی طرف سے عدم توجہی کی وجہ سے کلیسا کے احترام اور مذہب کے وقار کو زبردست ٹھیس پہنچ رہی تھی۔ سبے دینی بڑھتی جارہی تھی اور اس لیے ضروری تھا کہ ان کے اخلاق اور طرزِ حیات کے ساتھ ساتھ ان کے لغو اور مہمل عقیدوں کی بھی اصلاح کی جائے۔ پادریوں کی ایک مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے کالٹ (Colet) نے بجا طور کہا تھا کہ "کاش آپ لوگ ذرا اپنے نام اور اپنے کام کا پاس کرتے اور کلیسا کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوجاتے اس وقت سے زیادہ کبھی اصلاح کی ضرورت نہیں ہوئی تھی اور اس سے قبل کبھی کلیسا کی حالت پُر زور جدوجہد کی محتاج نہیں تھی ... ہمیں مرتدوں سے مشکلات پیش آرہی ہیں مگر ان کی مرتدانہ کارروائیوں میں کوئی کارروائی بھی ہمارے لیے اور تمام قوم کے لیے اس سے زیادہ نقصان دہ نہیں ہے جس قدر خود اہلِ کلیسا کے فاسقانہ اور متبدل اطوار ہمیں نقصان پہنچا رہے ہیں۔"

غرض کہ مذہب کی اصلاح بلکہ اصلاحِ کلیسا کی ضرورت کا ہر اس شخص کو احساس تھا جس کے دل میں کچھ بھی مذہب کا پاس تھا۔ مارٹن لوتھر (Martin Luther) سے قبل جان وائی کلف (John Wycliffe) نے انگلستان میں، جان ہس (John Huss) نے بوہیمیا میں، اور ساوونارولا ([illegible]) نے اطالیہ میں، پادریوں کی اخلاقی زبوں حالی اور دنیا پرستی کے خلاف آواز اٹھائی تھی مگر قبل از وقت ہونے کی وجہ سے وہ صدا بصحرا ثابت ہوئی لیکن نشاۃِ ثانیہ نے یورپ کی فکر و نظر کو اصلاحِ کلیسا کے لیے ہموار کر دیا تھا۔ اس لیے جب مارٹن لوتھر نے پوپ کی سیادت و اقتدار اور کلیسا کی خامیوں و کوتاہیوں کے خلاف آواز اٹھائی تو اسے نہایت ہی وسیع تائید اور ہر دل عزیزی حاصل ہوئی "مرتدانہ خیالات" پھر سے ایک بار زندہ ہو گئے لیکن برخلاف تحریکِ احیا یہ ایک خالص مذہبی تحریک تھی۔ مذہب کی مخالفت اور لامذہبیت سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ لوتھر زونگ لی ([illegible]) اور کالون ([illegible]) کے رگ و پے میں جذبۂ مذہبیت جاگزیں تھا۔ وہ مذہب سے سرشار تھے اور ان کا دلی منشا عوام الناس کو اصولاً مذہب کا پابند بنانا تھا۔ وہ اہلِ کلیسا کی ان کوتاہیوں اور

بدکاریوں کو رفع کرنا چاہتے تھے جن کی وجہ سے عوام کے دلوں سے مذہب اور مذہبی احکام کی عظمت و وقعت جاتی رہی تھی۔ مگر اس تحریک کے زیر اثر سولہویں صدی کے اوائل میں یورپ کی مذہبی وحدت ختم ہو گئی۔ انگلستان، اسکاٹ لینڈ، سویڈن، ناروے، سوئیزرلینڈ۔ اور جرمنی کے بعض علاقوں میں پوپ کی سیادت کے بجائے قومی کلیساؤں کا دور دورہ ہو گیا۔

نشاۃ ثانیہ اور تجدید دین کی تحریکوں نے اس طرح سے یورپ کے سیاسی اور ذہنی حالات و رجحانات میں ایک زبردست انقلاب پیدا کیا۔ مملکت، معاشرت، فطرت علوم و فنون وغیرہ کے متعلق قرونِ وسطیٰ کے مسلمات و معتقدات، تصورات نظریات کو پایۂ اعتبار سے ساقط کر دیا اور فکر و نظر کے حدود کو وسعت دے کر اخلاقی آزادی اور حصولِ علم کے ذوق و شوق کو ترقی دی۔ اس انقلاب نے یورپ کی تمدن و سیاسی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ جس طرح مذہبیات میں لوتھر تحریکِ اصلاح کا پیش رو اور علم بردار ہے اسی طرح سیاسیات میں میکیاویلی تحریکِ احیاء کا ترجمان اور نمائندہ ہے۔

۳۔ سولہویں صدی میں یورپ اور اطالیہ کا سیاسی نقشہ

میکیاولی کے سیاسی نظریات کو اس کے عہد کے مخصوص سیاسی حالات اور رجحانات کی روشنی ہی میں صحیح طور سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کا عہد سارے یورپ اور اطالیہ میں قرونِ وسطیٰ کے خاتمے اور ایک نئے عہد کے آغاز اور انقلابی سیاسی تبدیلی کا زمانہ تھا۔ قرونِ وسطیٰ کا ایک اہم ترین ورثہ یعنی کلیسا اور ریاست میں نمائندہ اور دستوری حکومت کا نظریہ پندرہویں صدی کے وسط تک زائل اور معدوم ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ تقریباً ایک صدی کے اندرونی خلفشار اور پاپائی عہدہ کے وقار میں زبردست کمی کے بعد تیزی سے پوپ کی مطلق العنان پوزیشن کو کلیسا کے اندر عروج ہوتا گیا۔ اسی کے متوازی مغربی یورپ کے تقریباً ہر حصہ میں بادشاہوں کی طاقت بھی بڑھتی گئی۔ اور تقریباً سب ہی بادشاہوں میں شاہی اقتدار کو دوسرے حریف اداروں یعنی جاگیردار طبقہ، پارلیمنٹ، پادریوں کے طبقہ اور آزاد شہروں کے مقابلے میں عروج ہوا اور عہد وسطیٰ کا نمائندہ اور دستوری نظام ختم ہو کر رہا صرف انگلستان ایک ایسا ملک رہ گیا تھا جہاں العنان ٹیوڈر بادشاہوں نے قومی پارلیمنٹ کو قایم رکھ کر اس کی مدد سے حکومت کی۔ جبکہ دوسرے ملکوں میں بادشاہوں نے پرانی پارلیمانوں کو پسِ پشت ڈال کر اور کلیسا سے گٹھ جوڑ کر کے مطلق العنانی کے راستے کو اپنایا۔ اس زمانہ میں نہ صرف حکومت بلکہ حکومت سے متعلق نظریات میں بھی جرت انگیز انقلاب رونما ہوا۔ سیاسی اقتدار جو قرونِ وسطیٰ کے دوران جاگیرداروں اور کارپوریشنوں کے درمیان منقسم تھا پندرہویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے تیزی سے بادشاہوں کے ہاتھوں میں مرتکز ہو گیا جو اپنی ان سلطنتوں میں قومی آزادی کی نمائندگی کرتے تھے سولہویں صدی میں یہ نظریہ کہ بادشاہ کی ذات خود اقتدار اعلیٰ

کا سرچشمہ ہے سیاسی فکر کا جزو لانیفک بن گیا۔ سیاسی نظریہ اور عمل میں یہ تبدیلی پورے سماج کے اندر ان انقلابی تبدیلیوں کی آئینہ دار تھی جو ایک عرصے سے جاری تھیں اور جن کی وجہ سے عہد وسطیٰ کے اداروں کی تنظیم نو کی گئی۔ آفاقی سلطنت کے نظریات کی موجودگی کے باوجود ان وسطیٰ اداروں کا وجود اس امر کا مرہون منت تھا کہ وسطیٰ سماج اپنی معاشی اور سیاسی تنظیم کے اعتبار سے پورے طور ایک مقامی سماج تھا۔ یہ مقامی سماج محدود ذرائع نقل و حمل اور مواصلات کی پابندی کا ایک ناگزیر نتیجہ تھا۔ اس صورت حال میں ناممکن تھا کہ علاقائی اکائیوں کو بڑی حد تک اندرونی آزادی دیئے بغیر کسی بڑے علاقہ پر حکومت کی جاسکتی۔ چنانچہ اس زمانہ کی تجارت بھی بیشتر مقامی نوعیت ہی کی ہوئی تھی جسے مقامی حکام کنٹرول کرتے تھے اور جس کے راستہ میں طرح طرح کی مقامی پابندیاں اور اجارہ دارانہ رکاوٹیں حائل تھیں۔ چودھویں صدی کے دوران نقل و حمل کی آزادی اور زر کا چلن دونوں مفقود تھے۔

لیکن نئے عہد میں ذرائع نقل و حمل کی آسانیاں بڑھنے اور مواصلات کے وسیع ہونے کے ساتھ تجارت میں توسیع ہوئی اب وہ مقامی پابندیوں اور اجارہ دارانہ رکاوٹوں سے بڑی حد تک آزاد ہو گئی تجارت کی توسیع و ترقی میں بڑا دخل آزاد تاجروں کا تھا جو پیشہ کاروں کی انجمنوں اور مقامی حکومت دونوں سے آزادی کے طالب تھے۔ اسی وجہ سے تجارت کا کنٹرول رفتہ رفتہ مقامی حکومت کے ہاتھوں سے مرکزی حکومت کو منتقل ہوا۔ سولہویں صدی کی ابتدا میں تقریباً تمام شاہی حکومتیں قومی وسائل اور قومی طاقت کو ترقی دینے اور ملک کی اندرونی و بیرونی تجارت کو فروغ دینے کی پالیسی پر کاربند تھیں۔

اس زبردست معاشی تبدیلی کے دوررس سماجی اور سیاسی نتائج برآمد ہوئے۔ سلطنت روما کے زوال کے بعد پہلی بار یورپی سماج میں ایک متوسط یا درمیانی طبقہ وجود میں آیا جو مال و زر کے ساتھ کاروباری صلاحیت بھی رکھتا تھا۔ یہ طبقہ فطری طور سے امراء اور جاگیرداروں کے طبقہ اور ان کی مراعات کا شدید مخالف تھا۔ اس کا مفاد اس میں تھا کہ اندرونِ ملک امن و امان قائم رہے اور آزادانہ تجارت کی سہولتیں حاصل ہوں جس کی ضمانت صرف ایک مضبوط مرکزی حکومت دے سکتی

تھی۔ اس طرح وہ بیرونِ ملک بھی امن و امان اور مستحکم حکومت چاہتے تھے کہ بیرونی تجارت محفوظ رہے۔ اسی لیے انہوں نے طبقہ امراء کے برخلاف قومی بادشاہوں سے سیاسی اتحاد کیا۔ اس کی مثال ٹیوڈر انگلستان میں بادشاہ اور پارلیمان کے دارالعوام کے اتحاد و تعاون میں ملتی ہے جو انگریز درمیانی طبقہ کی نمائندگی کرتا تھا۔ ان لوگوں نے اپنی عافیت اس میں دیکھی کہ بادشاہ کے اقتدار کو قرونِ وسطیٰ کی تمام پابندیوں سے آزاد کیا جائے۔ امراء کی طاقت کو توڑنے کی غرض سے انہوں نے یہ بھی منظور کر لیا کہ پارلیمنٹ بادشاہ کی ماتحتی میں کام کرے۔ اور ہر لحاظ سے ان کا فائدہ اسی میں تھا کہ فوجی اور عدالتی اختیارات امراء کے ہاتھوں سے نکل کر بادشاہ کے ہاتھوں میں مرتکز ہوں۔ درمیانی طبقہ کی امن و امان اور مستحکم حکومت کے قیام کی یہی خواہش بادشاہ کی طاقت میں بے پناہ اضافہ اور اس کی سیاسی بالاتری کی باعث ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں بادشاہ اکثر ظلم و استبداد کے راستہ پر بھی چلنے لگے لیکن پائیدار شاہی حکومت جاگیردار طبقہ کی طوائف الملوکی اور چیرہ دستیوں سے بہر صورت بہتر تھی۔

چنانچہ سولہویں صدی کی ابتدا میں مطلق العنان بادشاہت مغربی یورپ کے ملکوں میں رائج طرزِ حکومت بن چکی تھی یا تیزی سے بنتے جا رہی تھی۔ مطلق العنان بادشاہوں کا طریقہ کار استبداد یا مطلق العنانی کا تھا۔ اسی کے ذریعہ انہوں نے وسطیٰ دستوری اداروں اور آزاد شہری مملکتوں کو یکسر ختم کیا جو وسطیٰ تہذیب کی بنیاد تھے۔ خود کلیسا بھی بادشاہ کی ماتحت ہو کر رہی۔ اور اس کے قانون سازی کے اختیارات بادشاہ کو منتقل ہو گئے۔ جس طرح پچھلے زمانہ میں مغربی یورپ کے تقریباً ہر علاقہ میں جاگیردارانہ دستوری بادشاہت کو تیزی سے عروج ہوا تھا اسی طرح اب مطلق العنان قومی بادشاہتوں کو فروغ ہوا۔ اسپین میں ازابیلا اور فرڈیننڈ، انگلستان میں ہنری ہفتم، فرانس میں لوئی یازدہم اس کی مثالیں تھیں۔

اطالیہ میں بھی نئے تجارتی اور صنعتی نظام کی طاقتیں بخوبی ابھر چکی تھیں اور پرانے سیاسی اداروں کا صفایا ہو رہا تھا لیکن اس زمانہ میں اطالیہ کے مخصوص سیاسی حالات کی بنا پر ان کی جگہ نئی تعمیری طاقتوں کو ابھرنے اور پنپنے کا موقع نہیں مل سکا جس وقت میکیاولی نے اپنے افکار کو قلم بند کرنا شروع کیا، اطالیہ متعدد چھوٹی

اکائیوں اور شہروں کے علاوہ پانچ بڑی ریاستوں میں منقسم تھا۔ جنوب میں نیپلز کی بادشاہت جو اپنے سیاسی استحکام کے لیے مشہور تھی، شمال مغرب میں میلان کی ڈچی جو پچھلی صدی میں جبر و طاقت کے استعمال سے مختلف جمہوریتوں اور امارتوں کے انضمام سے وجود میں آئی، شمال مشرق میں وینس کی اشرافی جمہوریہ جس کی ابتدا انتہاپسندانہ جمہوری مساوات سے ہوئی اور انتہا شخص آمیریت پر، وسط میں فلورنس کی جمہوریت جہاں سماجی نابرابری اور سیاسی افراتفری کا دور دورہ تھا۔ اور روم کی پاپائی ریاست جو مسیحی دنیا کا روحانی مرکز تھی۔ اطالیہ میں بھانت بھانت کی سیاسی اکائیوں کی تفصیل مقابل کے نقشہ میں دی گئی ہے۔

۱۵۱۲ء میں فلورنس کی جمہوریہ کے زوال (جس کے بعد میکیاولی نے اپنی جبری سیاسی گوشہ نشینی کا زمانہ اپنے سیاسی خیالات کو قلم بند کرنے میں گذارا) اس طرز حکومت کی نااہلی کا آئینہ دار تھا جو زمانہ کی سیاسی طاقتوں سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ سیاسی طاقت کے ارتکاز اور استحکام کی تنہا مثال روم کی پاپائی ریاست تھی لیکن بدقسمتی سے پاپاؤں نے وسطِ روم میں ـــ اپنی بالاتری کو قایم کرنے کی لالچ میں دوسری اطالوی ریاستوں کے اتحاد کی راہ میں ہمیشہ رکاوٹ ڈالی اور جب کبھی کوئی ریاست طاقت ور ہوتی تو پوپ غیر ملکی فوجوں کو دعوتِ مداخلت دے کر اس کا قلع قمع کرا دیتا۔ چنانچہ سوائے روم کے اگرچہ جزیرہ نما کے دوسرے حصوں میں سیاسی اقتدار اعلیٰ کے ارتکاز کا عمل شروع ہو گیا تھا لیکن تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔ اس وجہ سے اطالیہ کی سیاسی ترقی مقید ہو کر رہ گئی۔ اس ملک پر کوئی ایسی بالاتر طاقت نہیں اُبھر سکی جو سارے جزیرہ نما کو ایک پرچم تلے متحد کر سکتی۔ کلیسا کی غداری، آپس کی خانہ جنگیوں، اقتدار کی رسہ کشی اور سیاسی سازشوں اور بغاوتوں کے طفیل اطالوی قوم فرانسیسیوں، اسپینیوں اور جرمنوں کی چیرہ دستیوں کی شکار ہوتی رہی۔

یورپ اور اطالیہ میں واقع ہوئی ان تبدیلیوں کے زیر اثر سیاسی نظریہ میں بھی انقلاب آیا۔ میکیاولی اس نظری انقلاب کا سب سے بڑا ترجمان ہے۔ سولھویں صدی کی ابتدا میں میکیاولی نے پوری تاریخ کے اس مرحلہ پر آنکھ کھولی

جو قرونِ وسطیٰ اور عہدِ جدید کے درمیان حدِ فاصل تھا۔ اس عہد کا کوئی دوسرا مفکر اتنی صفائی اور ژرف نگاہی سے یورپ کے اس وقت کے سیاسی ارتقاء کی سمت کو نہ دیکھ سکا جتنا کہ میکیاولی نے۔ اس نے قدیم اداروں کی فرسودگی اور زوال کی حقیقت کو اور نئے سیاسی نقشہ کی تشکیل میں قومی وحدت پر مبنی برہنہ طاقت کے رول کو فوراً تسلیم کیا۔ میکیاولی سے قبل سیاسی فلسفہ تمام تر اس نظریہ پر مبنی تھا کہ انسان کا مطمحِ نظر صالح زندگی ہے۔ سیاسی اقتدار اور ریاست اسی مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن میکیاولی نے نئے زمانہ کی حقیقت دریافت کی کہ سیاسی اقتدار بذاتِ خود ایک مقصد ہے اور مملکت کے وجوہ اور استحکام کے لیے ہر طرح کے ذرائع استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ چونکہ میکیاولی نے اپنے زمانہ کی اطالوی سیاست میں فطرتِ انسانی کی سیاہ کاریوں کا عینی مشاہدہ کیا تھا لہٰذا اس کے سیاسی خیالات سولہویں صدی کے اطالیہ کے اصل حالات کے مطابق تھے۔

۴۔ میکیاولی کا طریق کار اور سیاسی طرزِ فکر

میکیاولی کو عام طور سے عصرِ جدید کا پہلا سیاسی مفکر کہا جاتا ہے اور یہ کسی بڑی حد تک صحیح بھی ہے کیوں کہ اس کی تصنیفات میں بعض ایسے نظریات ملتے ہیں اور اس کی طرزِ فکر میں ایسی جدت و ندرت جن کا قرونِ وسطیٰ میں پتہ بھی نہ تھا۔ اور جو آج بھی فلسفۂ سیاسیات کا اہم و قیمتی عنصر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ارسطو کے بعد وہ پہلا عالم ہے جس نے متجسس دماغ پایا تھا اور جس نے تاریخ اور تجربہ کی روشنی میں سیاست کے اصول و مقاصد کی توضیح و تعین کرنے کی کوشش کی اور مملکت کے بقا اور استقلال کے مسئلہ پر خالص ذہنی تحقیق کی۔ اپنی مشہور کتاب "حکمراں" کے ذکر میں وہ لکھتا ہے کہ میں نے اس بحث پر غور کرنے میں اپنی انتہائی قابلیت صرف کر دی ہے کہ حکومت کی حقیقت کیا ہے، اس کی اقسام کیا ہیں، اس کے حصول کی تدابیر کیا ہیں، اور ان اسباب و علل سے بحث کی ہے۔ جن سے وہ قایم رہتی ہے اور جن سے وہ فنا ہو جاتی ہے۔"

۱۰ دسمبر ۱۵۱۳ء کو میکیاولی نے اپنے دوست فرانسسکو وتیوری (Fran-cisco Vittori) کے نام جو خط لکھا وہ اس کے طرزِ فکر اور مقصد کو بخوبی واضح کرتا ہے۔ اس نے لکھا کہ:

"ادھر شام ہوتی اور میں گھر واپس آیا اور مطالعہ کے کمرہ میں داخل ہو گیا۔ داخل ہونے سے پہلے میں گرد و غبار سے اٹے ہوئے دہقانی کپڑے اتار ڈالتا ہوں اور شریفانہ درباری لباس پہن لیتا ہوں۔ جب اس طرح مناسب لباس پہن کر قدیم درباروں میں حاضری دیتا ہوں تو یہاں لوگ مجھ سے اخلاق سے پیش آتے ہیں اور مجھے وہ غذا نصیب ہوتی ہے جو مجھے بہت مرغوب ہے۔ میں ان سے

اپنے دل کی باتیں کہنے میں ذرا بھی نہیں جھجکتا انہوں نے اپنی زندگیوں میں کچھ کیا میں ان سے اس کا سبب دریافت کرتا ہوں اور وہ مجھ پر ایسے مہربان ہیں کہ مجھے سب کچھ بتا دیتے ہیں۔ اس طرح چار گھنٹے گذر جاتے ہیں اور تھکان ہے کہ مجھے چھو بھی نہیں جاتی اتنی دیر کے لیے میں اپنی ساری مصیبتیں بھول جاتا ہوں۔ افلاس کا خیال مجھے پریشان نہیں کرتا۔ موت کے خیال سے بھی مجھے ذرا وحشت نہیں ہوتی۔ اتنی دیر بس ان عظیم الشان ہستیوں کا دھیان میرے ذہن پر پوری طرح چھایا ہوا ہوتا ہے۔ دانتے نے کیا خوب کہا ہے کہ علم کا انحصار ان معلومات پر ہے جو انسان محفوظ رکھ سکے، باقی فضول ہیں، چنانچہ ان عالی مرتبت اشخاص کے ساتھ مکالمہ سے جو کچھ حاصل ہوا وہ میں نے سپرد قلم کر ڈالا ہے۔ اور اس طرح مملکتوں (. . r . i— — alities) پر ایک تصنیف تیار کی ہے۔ اس کتاب میں، میں نے موضوع کے ہر پہلو سے بحث کی ہے، مملکت کیا ہے؟ اس کی کتنی اقسام ہیں؟ وہ کس طرح برقرار رکھی جا سکتی ہے؟ وہ کیوں کر ختم ہوتی ہے؟ اگر اس سے پہلے کبھی بھی تم نے میرے خیالات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہو گا تو یقین ہے کہ یہ کتاب تمہیں ناپسند نہ ہو گی۔ رہے بادشاہ، خاص کر نئے بادشاہ تو انہیں اس کتاب کا خیر مقدم کرنا چاہیے یہی وجہ ہے کہ میں اس کتاب کو ژیولیانو کے نام معنون کر رہا ہوں ... اس مختصر سی کتاب کے پڑھنے سے تمہیں معلوم ہو گا کہ یہ پندرہ برس جو میں نے دستور جہاں بانی کے مطالعہ میں صرف کیے وہ رائگاں نہیں گئے۔ میں نے اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا .... میرا افلاس میری ایمانداری کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔"

میکیاولی کے فلسفہ کا طریق اور اس کا نقطۂ نظر مندرجہ بالا اقتباس سے بخوبی عیاں ہو جاتا ہے۔ اس خط سے اس الزام کی حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس کا منشاء لورنزو دی میڈیچی (Lorenzo De [illegible]) کے بے جا خوشامد کے ذریعہ اس کی نظر التفات کو اپنی جانب متوجہ کرنا تھا اس نے شروع میں کتاب کا نام "مملکت" تجویز کیا تھا لیکن حالات کی تبدیلی اور ناسازگاری نے "حکمراں" رکھنے پر مجبور کیا جس طرح کتاب کے نام میں تبدیلی ہوئی اس طرح انتساب بھی بدلا یعنی ژیولیانو کے بجائے لورنزو

دی میڈیچی کے نام سے معنون ہوئی۔

غالباً نامناسب نہ ہوگا اگر اس موقع پر "حکمراں" کی بعض ان خوبیوں کا بھی ذکر کر دیا جائے جن کی وجہ سے پڑھے لکھے حلقوں میں اور خاص کر سیاست دانوں اور سیاست سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے "حکمراں" آج بھی ایک خاص کشش رکھتی ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے جو میکیاولی کی بہت دنوں کی محنت، مسلسل مطالعہ اور غور و فکر کا نچوڑ ہے۔

میکیاولی کے لفظوں میں۔

"میں نے یہ کوشش نہیں کی ہے کہ اسے خوبصورت الفاظ یا خطیبانہ کلمات اور دوسری ظاہری خوبیوں سے سجاؤں جو اس قسم کی تصانیف میں اکثر ہوتی ہیں۔ مجھے یہ منظور رہے کہ اس کتاب کی مدح وثنا، سرے سے نہ ہو لیکن اگر ہو تو اس وجہ سے ہو کہ اس میں سچائی اور وزن ہے۔"

"حکمراں" کی پہلی خوبی اس کتاب کا اختصار ہے۔ لیکن مختصر ہونے کے باوجود اس میں ان تمام مسائل پر تبصرہ و تنقید ہے جو آج بھی موضوع گفتگو و بحث ہیں۔ مثلاً شہریت اور شہری کے قومی و ملی فرائض، آئین جہاں بانی ([illegible]) اور سیاسی اقتدار وغیرہ۔

مختصر لیکن ساتھ ہی بین الاقوامی سیاست کی اچھی ہینڈ بک ہونے کے علاوہ "حکمراں" کا اسلوب یا انداز بیان نہایت ہی صاف، شستہ اور رواں ہے۔

میکیاولی کی طرزِ فکر کے سلسلہ میں دو باتیں یاد رکھنا ضروری ہیں: اول یہ کہ اس کے سیاسی نظریات اور طریق فکر نے قرون وسطیٰ کے سیاسی نظام اور نظریات کو بالکل ختم نہیں کر دیا۔ وہ اس دور کے سیاسی اور ذہنی طرز فکر کا باغی تھا اور اپنی بغاوت میں کامیاب ہوا لیکن وہ نظریات اور طرزِ فکر کا جن نمائندہ و ترجمان طامس اکوی ناس (Thom[illegible]) ہے۔ وہ اب بھی کلیسائی اور کیتھولک مفکروں کے فلسفہ کی روح ہیں اور اس لحاظ سے یورپ کی موجودہ تہذیب کا اسی طرح ایک جزو ہیں جس طرح میکیاولی کا نکتہ نگاہ اور انداز فکر۔ دوم یہ کہ میکیاولی احیاء و اصلاح کی ان دو تحریکوں میں سے صرف ایک کا نمائندہ

ہے۔ جو عصرِ جدید کی تہذیب و تمدن، علوم و فنون اور سیاسی اور معاشی نظام کا سنگ بنیاد ہیں۔

میکیاولی نہ صرف اپنے دور کی پیداوار تھا بلکہ اس کا حقیقی ترجمان بھی تھا۔ سولھویں صدی کے سیاسی و ذہنی رجحانات کی جیتی جاگتی تصویر ہمیں اس کی تصنیفات میں ملتی ہیں اور قرون وسطیٰ کے سیاسی عقائد اور نظریات کو جس عدم توجہی سے وہ بیک قلم رد کر دیتا ہے وہ لاجواب اور عدیم المثال ہے۔ بقول لارڈ برائس (Lord Bryce) قرونِ وسطیٰ میں سیاست کا قطعی وجود نہ تھا۔

سلطنتِ مقدونیہ کے زوال اور یونان کی خود مختاری سلب ہو جانے کے بعد اہلِ روم نے ایک عظیم الشان سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی اور رفتہ رفتہ یونان سے لے کر انگلستان تک ساری "مہذب دنیا" کو اپنے میں جذب کر لیا تھا۔ لیکن جب جمہوریۂ روم میں نظامِ شاہی قائم ہوا تو اس تبدیلی کا اثر روم کے مقبوضات اور باج گذار علاقوں کی نہ صرف سیاسی زندگی پر بلکہ سیاسیات پر بھی بہت گہرا اور دیرپا ہوا تھا۔ رومی سلطنت میں آزادانہ سیاسی زندگی فنا ہو گئی اور گو شہری قانون اور نظم و نسق میں کافی ترقی ہوئی لیکن نظری سیاسیات میں کسی اضافہ یا ترقی کا ثبوت نہیں ملتا۔ بقول پولک (Pollock) [illegible]

" رومن بہت بڑے حکمران اور مدبر تھے۔ انہوں نے باضابطہ قوانین بھی بنائے لیکن فلسفہ میں یہ صرف یونانیوں کے شاگرد اور ان کی نقل کرنے والے تھے ....(کیونکہ) جس روشن خیالی کی فضا میں یونانی خیالات کی نشو نما ہوئی تھی اور جسے ارسطو ایک معمولی شہری کی سیاسی زندگی کی تکمیل کے لیے ضروری سمجھتا تھا وہ اس زمانہ میں بالکل معدوم ہو چکی تھی اور اس کی ازسرِ نو تعمیر کی ضرورت تھی۔"

قرونِ وسطیٰ میں سیاسی زندگی کے ساتھ روشن خیالی بھی مفقود ہو گئی تھی اور اور بقول ڈننگ (D...) "یورپ مایوسانہ عقیدہ اور شرمناک وہم پرستی میں مبتلا ہو گیا تھا"

قرونِ وسطیٰ کا سب سے اہم مسئلہ کلیسا اور مملکت کا قبضہ تھا۔ جن لوگوں کو سیاست سے دلچسپی تھی یا جن میں غور و فکر کا مادہ تھا ان کی ساری کاوش و توجہ

اس مسئلہ پر مرکوز تھی کہ دنیاوی اور دینی حکومت میں کیا رشتہ ہونا چاہیے۔ اپنی اپنی پسند و رجحان کے مطابق وہ پوپ یا شہنشاہ کے بلند بانگ دعووں کی تائید یا تردید کرتے تھے۔ دماغی تجسس اور خالص ذہنی فکر جو یونانی مفکروں اور فلسفیوں کا طرۂ امتیاز تھا اور عصر جدید کے مفکرین کا خاصہ ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں اس کا قطعی فقدان تھا اور اسی لیے فلسفہ سیاسیات کے نقطۂ نظر سے قرونِ وسطیٰ کو یورپ کا "تاریک دور" کہا جاتا ہے۔ دانتے (Dante) اور اکوی ناس (Acquinas) قرونِ وسطیٰ کے بہترین دماغ ہیں۔ لیکن فلسفۂ سیاسیات کی قلمرو میں وہ مناظرین سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ ان کی تصانیف کا بحث وہی قرونِ وسطیٰ کا فرسودہ مسئلہ ہے کہ پوپ اور شہنشاہ میں کون افضل اور برتر ہے۔ ان کی تصانیف میں نہ تو کوئی مکمل سیاسی نظریہ ملتا ہے اور نہ کوئی نیا خیال ہے استدلال کے بجائے شوکتِ الفاظ اور ادیبانہ بلند پروازیوں سے کام لیا گیا ہے لطف تو یہ ہے کہ ایک طرف تو "ڈی مونارکیا" (De Monarchia) میں دانتے نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ رومن قوم کو دنیا کو فتح کرنے کا اعزاز اور فرمانِ خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے عطا ہوا ہے اور مملکت کے سارے اختیارات براہ راست خدا کی طرف سے تفویض ہوتے ہیں اور حکومت کے معاملوں میں پوپ یا کلیسا کو مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ لیکن دوسری طرف وہی دانتے فریڈرک ثانی (Frederick II) ملحدین کے ساتھ اپنی "دوزخ" میں جگہ دیتا ہے۔ حالانکہ بظاہر دانتے کو اس کا شکر گذار ہونا چاہیے تھا کیونکہ فریڈرک ثانی مرتے دم تک پوپ کے خلاف برسرِ پیکار رہا کیونکہ اس کے نزدیک پوپ ایک ایسا شخص تھا جو زندگی کے اہم فرائض کو چھوڑ کر غیر ضروری عبادات میں پڑ گیا تھا۔ اسے مساوات یا انصاف کا بالکل پاس نہیں۔ وہ حضرت یسوع مسیح کا جھوٹا خلیفہ اور مار آستین ہے۔ اور محض حکومت کی خوش حالی اور عظمت کے رشک سے وہ دنیاوی معاملوں میں بے جا دخل دیتا ہے"

دینوی اور دنیاوی طاقتوں کے درمیان تصادم اس وجہ سے تھا قرونِ وسطیٰ میں مذہب اور سیاسیات کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا

کہ سیاست کو مذہبیات کا تابع تصور کیا جاتا تھا۔ اگرچہ عملی سیاست اور اخلاقیات میں کوئی خاص رابطہ نہیں تھا۔ اس لیے میکیاولی کے نظریات اور طرزِ فکر میں جو بات سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ اس کی سیاست میں مذہب کے عمل دخل کے خلاف بغاوت ہے۔ اس دور کا مسلمہ نظریہ یہ تھا کہ انسان حیوانیت اور روحانیت سے مرکب ہے اور اس کی زندگی کی اصلی و حقیقی منزل آخرت ہے۔ یہ دنیا عیش و عشرت کا مقام نہیں بلکہ دارالمحن ہے۔ جتنا ہی انسان اس دنیا اور اس کی لذت و خواہشات سے تعلق رکھے گا اتنا ہی وہ گندگی سے آلودہ ہوگا اور اسی قدر وہ مزید عذاب کا مستحق ہو جائے گا۔ یہ خیال عام تھا کہ انسان اس دنیا میں کام کرنے اور یہاں کے معاملوں کو چلانے نہیں آیا بلکہ وہ ایک گندگی اور نجاست میں پھینک دیا گیا ہے جس سے اسے بچنا اور دور بھاگنا چاہیے اگرچہ انسان فطری طور سے مدنی الطبع اور آرام و آسائش کی زندگی کا خواہش مند ہے لیکن اس کا حقیقی مقصد اور اصلی خواہش نجاتِ اُخروی حاصل کرنا ہے۔ چونکہ انسانی زندگی کے دو پہلو اور مقصد ہیں اس لیے دو قسم کے قوانین۔ الٰہی اور انسانی۔ کی ضرورت ہے، جو اس کے لیے دنیوی فلاح اور اخروی نجات کا ذریعہ بنیں۔ انسانی قانون کا منشا، اس کی دنیاوی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ تاکہ وہ آرام و اطمینان کی زندگی بسر کر سکے۔ اور قانونِ الٰہی اس کی رشد و ہدایت کے لیے ناگزیر ہے تاکہ وہ اپنی روحانی اصلاح کر کے نجات دارین حاصل کرے۔ چونکہ روحانی اصلاح اور نجات اُخروی کو مادی فلاح اور دنیاوی راحت پر ترجیح ہے اس لیے قانونِ الٰہی کو انسانی قانون پر فوقیت حاصل ہے اور چونکہ قانونِ الٰہی کا محافظ و ترجمان کلیسا ہے لہٰذا کلیسا کو ہر دنیاوی ادارہ پر فوقیت اور ترجیح حاصل ہونی چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں مملکت اور عمال حکومت کو کلیسا اور کلیسا کے عالموں کا مطیع و معتقد ہونا چاہیے۔ جان سالسبری (..... John Salisbury) کے الفاظ میں "حکمراں" درحقیقت قسیسوں کا خادم ہے اور ان مقدس فرائض کو انجام دیتا ہے جن کا قسیسوں کے ہاتھ سے انجام پانا ان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ ربانی قانون کا ہر ایک فرض اگر مذہبی و مقدس

ہے تاہم جرائم کی سزا دینا پست درجہ کا کام ہے اور ایک طرح سے جلاد کے کام کے مشابہ معلوم ہوتا ہے۔"

جرأت رندانہ سے کام لے کر میکیاولی نے حشر ونشر اور نجاتِ اخروی کو سیاسی اور معاشرتی زندگی کے محرکات کے زمرہ سے خارج قرار دیا۔ اور دنیوی راحت اور مادی فلاح کو سیاست کا موضوع اور مملکت کا منشا و مقصد بتایا۔ اس طرح قانونِ الٰہی اور انسانی قانون کی تعریف اور کلیسا یا مملکت کی برتری کے سوال کو خارج از بحث کر دیا۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ مذہب کی تذلیل کرنا چاہتا تھا؛ اسے ختم کرنا چاہتا تھا۔

"مقالات" اور "حکمراں" دونوں میں وہ مذہب کی افادیت و اہمیت کا اعتراف کرتا ہے اور اس امر پر زور دیتا ہے کہ شہری زندگی کے میعار کو بلند اور برقرار رکھنے کے لیے مذہب کا وجود مفید اور ضروری ہے۔ وہ مذہبی مدرسوں کے لوگوں کی طرح (schoolmen) مقلد اور مذہبی نہیں ہے۔ اس نے اپنے نظریات قایم کیے۔ اور تجربے کی روشنی میں اس نے خود بھی اس بات کا بار بار اظہار کیا کہ "میں نے پندرہ برس دستور جہاں بانی کے مطالعہ میں صرف کیے وہ رائیگاں نہیں گیے" اور اسی لیے اس کی تصانیف میں جذبات کی روانی اور گرم جوشی کے بجائے عقل و دماغ کی سنجیدگی اور متانت حاوی ہیں۔ وہ "اشیاء کی واقعی صداقت" کا قائل اور متجسس ہے اور اسی لیے ارسطو کی طرح اپنے نظریات کی تائید میں خشک واقعات اور دلیلوں کا ان گنت انبار لگا دیتا ہے۔ یہ وہ طریقِ فکر ہے جو قرونِ وسطیٰ میں مفقود تھا۔ اس کا موضوعِ فکر "مملکت" تھا۔ اور مملکت کی اقسام، بقا اور استقلال پر اس نے خالص ذہنی وفنی تحقیق کی اور اس کے ذیل میں سیاست کے مقاصد اور سیاسی زندگی کے محرکات کی تشریح بھی کی۔

دوسرے لفظوں میں میکیاولی کو بجا طور پر جدید علم سیاسیات کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ سیاسیات کو مذہب اور اخلاقیات سے جدا کر کے وہ یہ مفروضہ قایم کرتا ہے کہ سیاسی مشورہ اور سیاسی پالیسی کو اخلاقیات سے مقید نہیں کرنا چاہیے اگر سیاسیات کو ایک علم کا درجہ حاصل کرنا ہے تو اس کے اپنے علیحدہ اصول

ہونے چاہئیں۔ ارسطو نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے۔ اور سینٹ ٹامس نے یہ نظریہ وضع کیا کہ انسان ایک اخلاقی حیوان ہے۔ لیکن میکیا ولی کا اولین نظریہ اپنے پیش رووں کے نظریہ سے آگے جاکر سماجی اور سیاسی تنظیم کی سطح پر سکوت سے بحث کرتا ہے۔ یعنی اس کا نظریہ تمام تر سیاسی زندگی کے حقائق پر مبنی ہے۔ "مقالات" کے باب ۲۶ میں وہ مفتوحہ ریاست کے حکمراں کو وہاں کی سیاسی زندگی کی از سر نو تنظیم کا مشورہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ "تمام جمہوریتوں میں خواہ ان کی تنظیم کسی طرح کی ہو، کبھی بھی چالیس یا پچاس سے زیادہ شہری ایسے نہیں ہوتے جو ایسا مرتبہ حاصل کر پائیں جس کی رو سے حکمرانی کے حق دار ہو سکیں"۔ زمان و مکان سے قطع نظر ہر سیاسی نظام میں کچھ ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو حکومت کرتے ہیں اور بہت سارے ایسے ہوتے ہیں جن پر حکومت کی جاتی ہے۔ اس کا اطلاق جمہوریتوں، آمریتوں اور آزاد و محکوم معاشروں سبھی پر یکساں طور سے ہوتا ہے۔ میکیا ولی کا نظریہ اخلاقی نوعیت کا قطعاً نہیں۔ اس کے برخلاف یہ محض سیاسی زندگی کی ایک حقیقت کی تشریح کرتا ہے جو اسی زمانہ سے موجود ہے جب سے سیاسیات کی ابتدا ہوئی۔ اخلاقیات، جمہوریت اور آزادی کے تصورات کو اسی حقیقت پر مبنی ہونا چاہیے۔

میکیا ولی کے نظریے کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ سیاست کا تعلق تنظیم سے ہے: سیاسی مقاصد اسی صورت میں حاصل کیے جا سکتے ہیں اور اس سلسلہ میں مناسب وسائل اسی وقت کام میں لائے جا سکتے ہیں جب کہ لوگ اس غرض سے خود کو منظم کریں۔ اور تنظیم کا بنیادی اصول تقسیم کار (Division — of Labour) کا اصول ہے۔ جس طرح فوج کی ذمہ داریوں کو جنرلوں اور عام سپاہیوں کے درمیان تقسیم کیا جاتا ہے اسی طرح سیاسی زندگی میں بھی کچھ لوگ حکومت کرنے کے اہل ہوتے ہیں اور باقی لوگ وہ ہوتے ہیں جن کی بہت بڑی اکثریت ہوتی ہے۔ جن پر حکومت کی جاتی ہے۔ اس قانون کے دائرہ میں مختلف طرز کے حکومتی نظام پائے جا سکتے ہیں مثلاً جمہوریت، اشرفیت، آزاد مملکت، شخصی مملکت وغیرہ۔ لیکن ان سبکو سیاسی تنظیم کے بنیادی اصول کی روشنی

میں دیکھنا چاہیے۔ یعنی کچھ باتیں ایسی ہیں جنہیں عوام الناس کی اکثریت کرنے کی اہل نہیں ہے اور کچھ ایسی ہیں جنہیں وہ کرسکتی ہے۔ میکیاولی کے نزدیک ان عملی سوالات کو اخلاقیات سے کوئی واسطہ نہیں۔ مثلاً اسے اس مسئلہ سے کوئی سروکار نہیں کہ کیا عوام کو اخلاقی بنیاد پر سرکاری فیصلہ سازی کے کام میں شریک کیا جائے۔ اس کا موقف یہ ہے کہ سیاسیات کے اصولوں کو علمی بنیادوں پر اور تجربی تحقیق کی روشنی میں وضع کیا جانا چاہیے۔ علم سیاسیات اور سیاسی تحقیقات دونوں کی اساس یہ اس نظریے پر ہونی چاہیے سیاسی اقتدار ہمیشہ محض اقلیت کے ہاتھوں میں رہتا ہے۔ اسی لیے میکیاولی نے اپنی بیشتر توجہ اسی حکمران اقلیت پر صرف کی ہے۔ "حکمران" اور "مقالات" دونوں اسی محدود حلقہ کے لیے تصنیف کی گئی ہیں۔ خاص طور سے "حکمران" ان لوگوں کے لیے ہے جو سیاسی اقتدار کو موثر طریقہ سے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اسے محض افراد سے دلچسپی ہے جو یا تو سیاسی طبقہ خواص (Political Elite) میں شامل ہیں یا ان میں شامل ہونے کے لیے کوشاں ہیں۔ بلکہ اکثر و بیشتر اس کی توجہات کا مرکز وہ فرد ہوتا ہے جو سیاسی اقتدار کے زینہ کی اعلیٰ ترین کڑی تک پہنچ چکا ہے اور وہاں پہنچ کر اس پر برقرار رہنا چاہتا ہے۔ لیکن جس طرح ایک کاروبار کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ اس کے کاروبار میں نفع ہو اسی طرح ایک حکمران اسی وقت تک کامیاب ہے جب تک وہ برسر اقتدار ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ میکیاولی کو مملکت کے استحکام کے ساتھ ساتھ حکمران طبقہ کے کیریر (Career) سے بھی دلچسپی ہے۔ میکیاولی کا آخری معیار حکمرانوں اور حکومتوں کی بقا ہے۔ مملکت کا اصل مقصد آزادی یا اپنے شہریوں کی بہتر زندگی کو پروان چڑھانا یا ان کو نیک بنانا نہیں بلکہ اس کا اصل مقصد اپنے وجود کو برقرار رکھنا ہے۔ اگر شہریوں کو آزادی دے کر اس کا وجود سلامت رہتا ہے تو اس کے شہریوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہونی چاہیے اور حکومت کو جمہوری ہونا چاہیے اسی طرح سے وہ مطلق العنان بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن میکیاولی انسانی آزادی اور قانون کی حکمرانی (Rule of Law)

کا بھی نقیب ہے۔ بشرطیکہ وہ سیاسی استحکام اور مملکت کی بقا کے لیے معاون ہوں۔

گو میکیاولی نے اپنی تمامتر توجہ حکمراں اقلیت پر مرکوز کی لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس نے محکوم اکثریت کو نظر انداز کر دیا۔ اگرچہ ہر سماج میں مردوں اور عورتوں کی عظیم اکثریت کی بڑی خصوصیت ان کی بے عملی ہے لیکن اس کے معنی فقط اتنے ہیں کہ وہ عمل کے بجائے ردعمل کرتے ہیں اور اگر کوئی ہوشیار حکمراں چاہے تو بڑی آسانی سے ان کے احساسات اور طرز عمل کی پیش بینی کر سکتا ہے۔ انسانی طرز عمل کی اسی پیش بینی کا میکیاولی کا سائنسی نظریہ دعوے دار ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ عام آدمی محض احمق یا جاہل ہوتا ہے۔ بلکہ وہ بھی سیاسی واقعات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کا بخوبی شعور رکھتا ہے کہ وہ اپنی حکومت سے کن باتوں کا متقاضی ہے۔ لیکن اس کے سیاسی شعور اور اس کے احساسات و خواہشات کا عموماً انتہائی سادہ پیرایہ میں اظہار ہوتا ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کا اظہار منفی صورت میں زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً عوام آزادی سے زیادہ جبر کی غیر موجودگی کے طالب ہوتے ہیں۔ "اس شہری کو جو عام چناؤ کے ذریعہ حکمراں ہوا ہو چاہیے کہ وہ عوام کی دوستی کو برقرار رکھے جو کہ بہت آسان بات ہے، کیونکہ لوگ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتے کہ ان پر ظلم و جبر نہ کیا جائے"۔ (حکمراں باب ۹)۔

اکثریت کو عموماً اپنے ملک کے سیاسی نظام سے اتنی غرض نہیں ہوتی جتنی کہ اپنی ذاتی سلامتی فلاح و بہبود سے اور اپنی املاک کے تحفظ سے۔ "جب تک عوام کی جائداد یا عزت پر حملہ نہیں ہوگا وہ سب مطمئن رہیں گے، اور حکمراں کو محض چند مخالفوں کے عزایم کا مقابلہ کرنا پڑے گا جنہیں وہ متعدد طریقوں سے پابند رکھ سکتا ہے"۔ (حکمراں باب ۱۹) مزید برآں "جمہور آزاد رہنا چاہتے ہیں، لیکن عظیم اکثریت کے نزدیک آزادی کے معنی محض ذاتی سلامتی اور حفاظت کے ہیں "حکمراں .... کو یہ معلوم ہوگا کہ شہریوں کی صرف ایک قلیل تعداد حکمرانی کرنے کے لیے آزاد رہنا چاہتی ہے جب کہ باقی لوگوں کی عظیم اکثریت اس لیے آزادی چاہتی ہے تاکہ اسے زیادہ سے زیادہ تحفظ حاصل ہو سکے"۔ (مقالات باب ۱۶)

عوام الناس کو "غیر سیاسی" (A-Political) قرار دینے سے

مراد محض یہ اشارہ کرنا ہے کہ ان کے پاس سیاست اور سیاسیات کے متعلق غور کرنے کے لیے نہ تو وقت ہے نہ علم اور نہ طاقت اور رجحان۔ مزید برآں، جو شخص سیاسی عمل کی پیچیدگیوں کو سمجھنا چاہتا ہے اسے سیاست کے پیچیدہ حقائق کے مطالعہ پر توجہ کرنا پڑے گی۔ سیاسی زندگی کی اصل ماہیت کو سمجھنے کے لیے بڑی کوشش درکار ہے۔ اس کوشش کے لیے چند ہی لوگ آمادہ ہو سکتے ہیں۔ عام لوگ تو محض ظواہر کی دنیا میں مگن اور گم رہتے ہیں۔ میکیاولی کہتا ہے کہ "عوام کی عظیم اکثریت محض ظواہر سے مطمئن ہے گویا وہی خود حقائق ہوں۔ بسا اوقات وہ حقائق کی بہ نسبت ظواہر سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ (مقالات" باب ۲۵) عوام کو کس طرح قابو میں رکھا جا سکتا ہے، اس کے لیے میکیاولی تین باتوں پر زور دیتا ہے: (۱) عوام کی اکثریت چند بنیادی ضروریات رکھتی ہے جن کی تکمیل کے بغیر ان کی اطاعت کی توقع عبث ہے۔ (۲) جب اکثر اپنی ضروریات کی طرف سے مطمئن ہو جاتی ہے تو وہ سیاسی اقتدار کو بہ خوشی اقلیت کے ہاتھ میں سپرد کر کے غافل ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں حکمراں اپنی آزادانہ مرضی سے کام کر سکتا ہے۔ وہ عوام کے سامنے سیاست کا ایسا نقشہ پیش کر سکتا ہے جس سے اس کی اپنی حیثیت مضبوط ہو۔ (۳) جب حکمراں کے پاس سیاسی اقتدار ہی ہو اور محکموں تک اپنے خیالات کو پہنچانے کی صلاحیت بھی تو اس کے لیے اپنی حیثیت کو مستحکم کرنا اور بھی آسان ہو گا۔ کیوں کہ عوام الناس ایسی پالیسیاں وضع کرنے سے قطعاً قاصر ہیں جو خود ان کے مفاد کے لیے بہترین ہوں۔ وہ اپنی ضروریات کا شعور رکھتے ہیں لیکن اس کی تکمیل کے ذرائع سے واقف نہیں۔ لہٰذا عوام کو اس مرحلہ تک پہنچانا چاہیے کہ وہ اپنے حکمراں کی ذات پر کلی اعتماد کریں تاکہ وہ ان کے لیے معقول پالیسیاں وضع کر کے ان پر عمل کر سکے۔

"یہاں پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نفرت صرف برے کاموں ہی کے سبب پیدا نہیں ہوا کرتی، اچھے کاموں کے وجہ سے بھی ہو جاتی ہے، اسی وجہ سے تو میں نے پہلے کہا کہ حکومت قایم رکھنے کے لیے حکمراں کو اکثر نیکی کا ساتھ چھوڑ کر برائی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ جب وہ جماعت بد اطوار ہو جس کی امداد

پر ہر بات کا دار و مدار ہے چاہے وہ جماعت عوام پر چاہے فوج اور چاہے
شرفاء پر مشتمل ہو، تو ضروری ہے کہ بادشاہ اس جماعت کے ساتھ نباہ کی صورت
پیدا کرے اور اس کی ہر طرح تشفی کرے ،ایسی صورت میں محض نیکی سے کام
نہ چلے گا" ("حکمراں" باب ۱۹)۔

عوام کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے حکمراں کو کیا کرنا چاہیے : اولاً اسے
بہت طاقتور ہونا چاہیے اور ضرورت کے موقع پر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے
کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس کی ذمہ داری مملکت کا انتظام سنبھالنا اور
اس کی بقا و استحکام کی ضمانت دینا ہے۔ اس کے لیے اسے بھلے برے سبھی
طرح کے ذرائع استعمال کرنے ہوں گے۔ دوم، حکمراں کو ظلم و جبر اور تخویف
و تہدید کو محض ان کے لیے نہیں بلکہ فقط کسی خاص سیاسی مقصد کے لیے استعمال
کرنا چاہیے۔ اور جہاں سب سے زیادہ مستعدی دکھانے کی ضرورت ہے
وہ ہے اندرونی مخالفوں سے نپٹنے کے سلسلہ میں۔ میکیاولی کہتا ہے کہ "جو
شخص بھی عوام پر حکومت کرتا ہے، لیکن یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتا کہ
کون لوگ اس کے نئے نظام کے مخالف ہیں تو اس کی حکومت محض تھوڑے
عرصہ کے لیے ہوتی ہے" (مقالات باب ۱۶)

الغرض میکیاولی کے نظریہ سیاست اور طرزِ فکر کے لب لباب کو اس کے
ہی الفاظ میں اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ "جو کوئی کسی سرزمین کی تصویر بنانا
چاہتا ہے تو پہاڑوں اور بلند مقامات کو سامنے رکھنے کے لیے میدانوں میں اتر
آتا ہے اور جب وادی کو سامنے رکھنا چاہتا ہے تو پہاڑوں اور ٹیلوں کا رخ
کرتا ہے، اس طرح رعایا کو سمجھنے کے لیے بادشاہ ہونا اور بادشاہوں کو جاننے کے لیے
رعایا میں سے ہونا ضروری ہے" اور سیاسی عمل کی پیچیدگیوں کے پیشِ نظر "ضرورت اس
بات کی ہے کہ حکمراں حیوانی صفات کا استعمال عقلمندی کے ساتھ کرے اسے نمونہ کے
طور پر شیر اور لومڑی دونوں کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے اس لیے کہ شیر اپنے آپ کو جال سے
نہیں بچا سکتا اور لومڑی بھیڑیوں کے مقابلہ میں لاچار ہوتی ہے۔ چنانچہ جال کا پتہ لگانے
کے لیے لومڑی اور بھیڑیوں کو بھگانے کے لیے شیر بننے کی ضرورت ہے"

۵۔ حکمراں

"حکمراں" کے مصنف کی حیثیت سے میکیاولی کو تاریخ و سیاسیات میں جو غیر معمولی حیثیت حاصل ہے اس کے پیش نظر یہ مناسب بلکہ بہت مفید ہوگا کہ ہم "حکمراں" کے مطالب اور مواد پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔ اس طرح ہم نہ صرف "حکمراں" کی مقبولیت کے راز سے واقف ہوسکیں گے بلکہ میکیاولی کے سیاسی نظریات کے بارے میں بھی زیادہ متوازن رائے قایم کرسکیں گے۔

"حکمراں" کی ابتدا ہی میں وہ کہتا ہے کہ حکومتیں دو قسم کی ہوتی ہیں: جمہوری طرز کی اور بادشاہت۔ بادشاہی حکومتیں موروثی ہوتی ہیں یا نئی نئی قایم شدہ (باب ۱)۔ لیکن "اس وقت میں جمہوریتوں کا ذکر نہیں کرتا، کیوں کہ اس سے قبل "مقالات" میں وہ ان پر تفصیل سے اظہارِ خیال کرچکا ہے۔ اس وقت میں صرف بادشاہتوں کے بارے میں لکھنا چاہتا ہوں" اور اس سلسلہ میں موضوع بحث یہ ہے کہ ... شاہی حکومتوں کی جو تقسیم میں نے کی ہے اس کے مطابق ان پر کیوں کر حکومت کی جائے اور انہیں کیسے برقرار رکھا جائے" نئی حکومتوں کی نسبت موروثی حکومتوں کو چلانا زیادہ آسان ہے کیوں کہ "لوگ ایک خاص خاندان کی حکومت کے عادی ہو جاتے ہیں" (باب ۲)۔ لیکن نئی حاصل کی ہوئی حکومتوں میں خاص طور سے دقتیں پیش آتی ہیں۔ ایسی بادشاہتوں میں گڑبڑ اور انقلابوں کا سبب وہ قدرتی پیچیدگیاں اور مشکلات ہوتی ہیں جو نئی فتوحات کے لوازم میں سے ہیں" (باب ۳)۔ نئی فتح کی ہوئی سلطنتیں اگر آزادی کی خوگر ہوں اور وضع کیے ہوئے قوانین کے تحت رہ چکی ہوں تو انہیں قابو میں کرنے کے لیے تین صورتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ انہیں بالکل تباہ و برباد کر دیا جائے۔ دوم یہ کہ فاتح حکمراں وہاں

بود و باش اختیار کرے اور سوم یہ کہ وہ خراج پر قناعت کرے اور وہاں کے پرانے قوانین باقی و جاری رہنے دے۔ اور وہاں اپنی پسند کے امرا کی حکومت قایم کر دے جو اس فاتح کے مفاد و مصالح کا خیال اور رعایا کو خوش و تابع دار رکھے (باب۔ ۵)۔ حکومت کا حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا بادشاہت کا قایم رکھنا۔ فرانسسکو اسفورزا (Francesco Sforza) اور سیزر بورجیا (Cesare Borgia) کے حالاتِ زندگی سے میکیاولی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "جو سلطنتیں یکایک وجود میں آتی ہیں ان کی جڑیں کھوکھلی اور ان کے تعلقات غیر مستحکم ہوتے ہیں۔ وہ آندھی کے ایک جھونکے کی بھی تاب نہیں لا سکتیں۔ یہ اور بات ہے کہ جنھیں قسمت سے اچانک بادشاہت ملے ان میں یہ بھی صلاحیت ملی ہو کہ وہ یہ جلد سیکھ لیں کہ اپنی بادشاہت کو کیوں کر قایم و استوار رکھیں۔" (باب۔ ۳)۔ بادشاہت کو قایم رکھنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور خصوصاً حکمراں کو اپنی نئی فتوحات کو اپنے قبضہ و قابو میں رکھنے کے لیے بہت سے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اور بعض اوقات اس کے لیے یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ رعایا کے دلوں میں خوف و محبت کا سکہ جمانے کے لیے وہ اڈیویرتو (Oli-verto) کی طرح ظلم، زد و ستم اور چال بازی سے کام لے۔ ایسی صورت میں یہ طے کرنا ضروری ہے کہ کون کون سے مظالم ناگزیر ہیں۔ نقصان پہنچانا ہو تو چاہیے کہ ایک دفعہ پہنچائے۔ تلخی دیر تک نہ رہے گی تو غصہ کی آگ بھی زیادہ نہ بھڑکنے پائے گی اور لطف و کرم اور نرمی سے کام لینا ہو تو تدریجاً، تاکہ لطف و کرم اور نرمی کا ذائقہ دیر تک باقی رہے۔" (باب۔ ۸) حکمراں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ سلطنت کی بنیادوں کو استوار و مضبوط کرے۔ اس امر کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ اچھے قوانین وضع و جاری کیے جائیں اور مضبوط و منظم فوج رکھی جائے لیکن یہ فوج خود اس کی اپنی ہونی چاہیے۔ کیوں کہ کرائے کی اور امدادی افواج بیکار بھی ہوتی ہیں اور خطرناک بھی۔ "ان کو بادشاہ سے کوئی ایسا دلی تعلق تو ہوتا نہیں کہ اس کے لیے اپنی جانیں کھپا دیں، بھلا کوئی دو چار ٹکے کے لیے اپنی جان قربان کیا کرتا ہے۔" (باب۔ ۱۲) جب تک ریاست کی اپنی قومی فوج

نہ ہوگی اس کی قوت و حفاظت کا انحصار اس کے زور بازو پر نہ ہوگا بلکہ قسمت پر۔ ممکن ہے کہ امدادی سپاہ بہترین سپاہ ہو اور بذات خود کارآمد بھی ہو مگر جو کوئی انہیں مدد کے لیے بلاتا ہے وہ عموماً نقصان میں رہتا ہے اس لیے اگر انہیں شکست ہوتی ہے تو وہ مارا جاتا ہے اور اگر فتح ہوتی ہے تو وہ ان کا قیدی ہو جاتا ہے۔" (باب۔ ۱۳)۔

حکمراں کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ لہو و لعب کے بجائے فن جنگ میں مہارت حاصل کرے۔ حکمراں کو یہ بھی چاہیے کہ وہ اپنے کو ان تمام اوصاف سے مزین و متصف کرے جن سے وہ عوام و خواص میں مقبول ہو سکے۔ لیکن یہ ممکن نہیں، اس لیے حتی الامکان ایسی باتوں سے بچنا چاہیے جن سے سلطنت کے خطرہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو۔ لیکن "اگر اس کی بدنامی ان ہی برائیوں کی وجہ سے ہو جن کے بغیر حکومت قایم نہ رہ سکتی ہو تو اسے اس کی ذرا بھی پروا نہیں کرنی چاہیے" (باب۔ ۱۵)۔

رعایا کا دل موہ لینے کے لیے مناسب اور بعض اوقات یہ ضروری ہوتا ہے کہ حکمراں فیاض و فراخ دل ہو۔ لیکن اتنا کشادہ دست ہونا بھی اچھا نہیں ہوتا کہ اپنی ساری دولت اسی میں صرف کر دے کیوں کہ ایسی صورت میں اس کے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ حکومت چلانے کے لیے وہ رعایا پر غیر معمولی محصول لگائے۔ ان کی جائدادیں ضبط کرے اور طرح طرح کی ترکیبوں سے روپیہ وصول کرے اور رعایا اس سے نفرت کرنے لگے۔ کشادہ دستی کی بہ نسبت کفایت شعاری بہتر اور مناسب ہے۔ اگر لوگ اسے کنجوس بھی کہیں تو اسے کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ "اگر حکمراں اس کی بدولت رعایا کو لوٹنے سے بے نیاز ہو جاتے، اپنی حفاظت اور مدافعت کر سکے، اور اسے اس کی ضرورت نہ رہے کہ رعایا پر غیر معمولی محصول لگائے تو اسے اس الزام کی بالکل پرواہ نہ کرنی چاہیے کیوں کہ کفایت شعاری یا کنجوسی ایسی برائی ہے جس سے حکومت کرنے میں مدد ملتی ہے۔" (باب۔ ۱۶)۔

حکمراں کے لیے یہ بہتر ہے کہ "لوگ اسے سنگ دل خیال نہ کریں بلکہ رحم

دل سمجھیں۔ مگر اس خصلت کے غلط استعمال سے اسے بچنا چاہیے۔ لیکن اسے اس کی پرواہ نہیں ہونی چاہیے کہ عوام الناس میں وہ سنگ دل مشہور ہو۔ "اگر وہ اس طرح اپنی رعایا کو متحد، مطیع و فرماں بردار رکھ سکے۔ دو ایک دفعہ سختیاں کر کے جو حکمراں فتنہ و فساد کا خاتمہ کر سکے وہ بالآخر ایسے حکمراں سے زیادہ رحم دل ثابت ہوگا جو رحم دلی کی وجہ سے ڈھیل دیتا چلا جائے اور جس کی وجہ سے لوٹ مار اور خون خرابہ ہوتا رہے اور بدامنی کا سلسلہ جاری رہے۔ ایسی رحم دلی سے پورے ملک کو نقصان پہنچتا ہے۔ برخلاف اس کے سختیوں اور سزاؤں کا اثر صرف چند افراد پر پڑتا ہے۔"

سیزر بورجیا سنگ دل مشہور تھا۔ مگر یہ سنگ دلی ہی تو تھی کہ رومانا کو پھر سے اتحاد نصیب ہوا۔ وہاں امن و امان کا دور دورہ ہوا اور اطاعت کی گئی۔"

یہ سوال اکثر کیا جاتا ہے کہ کیا حکمراں کے لیے یہ بہتر ہے کہ لوگ اس سے محبت کریں یا یہ کہ لوگ اس سے ڈریں؟

میکیاولی نے اس سلسلہ میں جو اظہار خیال کیا ہے وہ کافی غور طلب ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ حکمراں سے محبت کا دارومدار رعایا کے رویئے پر ہے اور دہشت کا انحصار خود اس کی ذات پر، اس لیے حکمراں کو چاہیے کہ اپنی عمارت (حکومت) ایسی بنیادوں پر کھڑی کرے جو اس کے اختیار میں ہوں نہ ان پر جن پر دوسروں کا اختیار رہو۔ البتہ نفرت سے بچنے کے لیے اسے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔" (باب۔ ۱۷)

حکمراں کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اچھی صفات کا حامل ہو مگر ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ سلطنت کی خیر و بقا کے لیے وہ ہر ممکنہ قدم اٹھانے اور ہر وسیلہ اختیار کرنے کے لیے تیار رہے۔ اور اپنے رویہ میں تبدیلی کے لیے وہ ہمیشہ آمادہ رہے

"حکمراں لومڑی کی طرح چالاک ہو تو کامیابی اس کے قدم چومے گی۔" (باب ۱۸) ناموری حاصل کرنے اور اپنی ہر دل عزیزی بڑھانے کے لیے حکمراں کو چاہیے کہ اہل علم و فن کی تمدردانی و سرپرستی کرے۔ اپنی رعایا اور رہنماؤں کو اہلِ حرف

وہ پیشہ کی ہر طرح سے ہمت افزائی کرے۔ جشنوں اور نمائشوں کے ذریعہ اپنی خوش خلقی اور فیاضی کا سب پر اظہار کرے (باب ۲۱) اپنے وزیروں اور معتمدوں کے انتخاب میں اسے بہت محتاط ہونا چاہیے (باب ۲۲) مگر اسے چاپلوسوں کی صحبت سے بچنا چاہیے (باب ۲۳) اگر ہم ان اسباب کا بغور مطالعہ و تجزیہ کریں جس کی وجہ سے اطالیہ کے رؤسا نے اپنی ریاستیں گنوائیں تو پتہ چلتا ہے کہ انکی ناکامی شکست یا جلا وطنی کا راز شرفا کی خود سری و خود مختاری یا عوام کی ان سے بدظنی ونفرت یا ان کے ناقص فوجی نظام میں مضمر ہے۔ "یہ خرابیاں نہ ہوں تو فوجوں کے ہوتے ہوئے سلطنتیں مغلوب نہیں سکیں" (باب ۲۴)۔

انسانی معاملات میں قسمت کو دخل ہے۔ مگر وہ بالکل لاچار نہیں ہے۔ اپنی عقل اور جد وجہد سے وہ ناساز گار حالات اور قسمت کی کارفرمائیوں کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ "جو حکمراں صرف قسمت پر بھروسہ کرتا ہے وہ قسمت پلٹنے پر کیوں کر تباہ نہ ہو، وہی حکمراں بہت کامیاب ہوتے ہیں جو اپنے اعمال کو زمانہ کے مزاج کے مطابق ڈھال سکتے ہیں"

"پوپ جولیس دوم کے تمام کاموں سے بے چینی عیاں ہے۔ زمانہ اور حالات کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ آندھی کی چال چلے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ کامیاب رہا" باب ۲۵)۔

باب۔ ۲۶ اور آخری باب میں اطالیہ کے قومی اتحاد اور سیاسی آزادی کی نہایت پرجوش اپیل ہے۔ دراصل "حکمراں" کا محرک اطالوی ریاستوں کی باہمی چپقلش اور خانہ جنگی، بین الاقوامی سیاست میں اسپین اور فرانس کے مقابلہ میں اطالیہ کی زبوں حالی اور میکیاولی کا جذبہ حب الوطنی تھا۔ اور ان سب باتوں کے پیش نظر اس کی یہ خواہش تھی کہ اطالیہ کو ایک متحد، آزاد اور طاقت ور ملک کی حیثیت سے یورپ کی سیاست میں وہی مرتبہ اور اہمیت حاصل ہو جو اس کی پرانی شاندار تاریخ اور زریں تمدن کے شایانِ شان ہو۔

"حکمراں" کے سرسری مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ میکیاولی کا منشا نہ کسی فلسفی کی تنقیص و تنقید تھا اور نہ کسی سیاسی نظریہ کی جرح و قدح۔

جس مسئلہ سے اسے دلچسپی تھی وہ بحث و مباحثہ یا فکر و نظر سے حل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے حل کرنے کے لیے ضرورت تھی عزم کی، عمل کی اور سعی پیہم کی، کیوں کہ اس مسئلہ کا تعلق عملی سیاست سے تھا، یعنی اطالیہ کی قومی آزادی واتحاد کے نصب العین سے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ میکیاولی نے اس کتاب کو اپنی زندگی میں شائع نہیں کرایا اور یہ اس کے انتقال کے پانچ برس بعد شائع ہوئی۔

"حکمراں" ایک مختصر مگر جامع بیاض یا ہینڈ بک (Hand Book) ہے۔ اس سے وہ لوگ استفادہ کر سکتے ہیں جو سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں یا اپنے اقتدار کو مزید مستحکم یا وسیع کرنے کے خواہاں ہیں اور وہ بھی جو بین الاقوامی سیاست اور سیاست کاری (Realpolitik) سے روشناس ہونا چاہتے ہیں) اور یہی وجہ ہے کہ گذشتہ چار سو برس میں یورپ کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں گذرا جس میں یورپ کے ممتاز مدبروں اور سیاست دانوں نے "حکمراں" کا غائر مطالعہ نہ کیا ہو، اس سلسلہ میں فرانسیسی مدبر رشلیو (Richlien)، سویڈن کی ملکہ کرسٹینا (Queen Christina)، پروشیا کے فریڈرک اعظم (Frederic the Great) جرمنی کے آہنی چانسلر بسمارک (Iron Chancellor Bismark) اٹلی کے مسولینی (MUsolini) اور سوویٹ روس کے لینن (Lenin) اور اسٹالن (Stolin) کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

اس ضمن میں یہ بات البتہ کھٹکتی ہے کہ حکمراں کو اپنی ہینڈ بک یا مشعل راہ بنانے والوں میں اکثریت ان مدبروں اور سیاست دانوں کی ہے جو ظالم و جابر ڈکٹیٹر (Dictator) تھے لیکن اس کے لیے میکیاولی مورد الزام نہیں کیوں کہ جس طرح سائنسی ایجادات اور ٹکنالوجی کو تعمیر و تخریب دونوں کے لیے کام میں لایا جا سکتا ہے اور لایا جاتا ہے اسی طرح مملکت اور سیاسی اقتدار فلاح و بہبود کا بھی موجب ہو سکتے ہیں اور ہلاکت اور تباہی کا بھی، اگر ایک طرف مملکت انسان کو متمدن اور اس کی زندگی کو مکمل بنا سکتی ہے تو دوسری طرف یہی مملکت اس کے

یے لعنت بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ حکومت یا حکمراں طبقہ اپنے وسیع اختیارات کو کس طرح اور کن اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے استعمال میں لاتا ہے ؛ قومی و ملی فلاح بہبود کے لیے یا اپنے ذاتی و خاندانی اثر و اقتدار کی توسیع و بقا کے لیے ؛ دنیا میں پائیدار اور مستحکم امن اور ہر ملک و قوم کی آزادی اور سالمیت کے احترام کی خاطر یا بین الاقوامی رسہ کشی (Power — Politics) انقلاب اور سامراجیت کے لیے ؛

فلسفۂ یونان کا نظریہ تھا کہ مملکت ایک سماجی تنظیم اور ادارہ ہے جو سوسائیٹی اور افراد کی ذہنی ترقی کے لیے ضروری ہے اور اس لیے وجود میں آتی ہے کہ شہریوں کی زندگی کو بہتر بنائے۔ قرونِ وسطیٰ کے عالموں کا عام عقیدہ تھا کہ ابدی نجات حاصل کرنے کے لیے سوسائیٹی اور سماج کا وجود ضروری ہے۔ سینٹ اگسٹائن (St. Augustine) جو افلاطون سے بہت متاثر تھا اور ٹامس اکوئی ناس (St. Thomas Aquinas) جو ارسطو کا شیفتہ تھا ان دونوں کے نظریات کی بنیاد دینیات پر ہے اور ان کی تعلیمات کا لب لباب یہ تھا کہ انسان کی سب سے بڑی سعادت یہ ہے کہ وہ خدا کی معرفت حاصل کرے اور اس کے لیے مدنیت کی زندگی مفید و معین ہے۔ ان دونوں نظریات کے مطابق گھوم پھر کر مملکت کی غرض و غایت صرف ایک ہے اور وہ سیاسی زندگی کی مناسب تنظیم کے ذریعہ افراد کی اخلاقی و ذہنی تربیت و اصلاح ہے۔

عصرِ جدید کے مفکرین میں میکیاولی سب سے پہلا مصنف ہے جس نے مادیت اور مادی فلاح کو سیاسی زندگی کا سنگِ بنیاد قرار دیا۔ ٹامس ہابز (Thomas — Hobbs) کی طرح اس نے فطرتِ انسانی کا نفسیاتی مطالعہ کیا اور ان اسباب و علل کا تجزیہ کیا جو انسان کی سماجی اور سیاسی زندگی کے محرکات ہوتے ہیں۔ ہابز کی طرح وہ بھی فطرتِ انسانی سے بدظن تھا۔ اس کے خیال میں انسان عام طور سے ناشکر گذار، کمزور، دغاباز، بزدل اور حریص ہوتا ہے۔ حریص ہونے کی وجہ سے اس کی خواہشات لامحدود ہوتی ہیں اور اس کی عملی زندگی خود غرضی پر مبنی ہوتی ہے۔ کمزور اور بزدل ہونے کی وجہ سے وہ دغاباز اور

بے ایمان ہوتا ہے۔ اس کے الفاظ میں "انسان ہمیشہ بدنظر آئیں گے یہاں تک کہ وہ نیک ہونے پر مجبور کیے جائیں" اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں شخصی املاک (Private Ownership) رکھنے کی بے انتہا خواہش ہوتی ہے۔ نہایت ہی بے دردی مگر انتہائی وثوق سے وہ "حکمران" میں کہتا ہے کہ:

"لوگ باپ کی موت کو آسانی سے بھول جاتے ہیں لیکن وراثت سے محرومی کا غم وہ کبھی نہیں بھولتے"

اس لیے وہ مشورہ دیتا ہے کہ امن و انتظام کی خاطر "سزائے قتل معقول حد تک کم ہونی چاہیے مگر جائیداد کی ضبطی بالکل نہ ہونا چاہیے" عوام الناس صرف عزت و جائیداد کی حفاظت چاہتے ہیں۔ عام کہاوت ہے کہ "آج مرے کل دوسرا دن" لیکن زن، زر، زمین فتنہ و فساد کے ایسے موجبات ہیں کہ ان کے اثرات دریشہ دوانیاں دُور رس بھی ہیں اور دیرپا بھی۔

"مقالات" میں میکیاولی نے اپنے نظریۂ مادیت کی کچھ زیادہ تشریح کی ہے اس کا قول ہے کہ عوام میں جمہوریت اور قومی آزادی کی خواہش صرف اس بنا پر ہوتی ہے کہ محکوم ہونے کی حالت میں ملک و قوم کی دولت و ذرائع سے صرف حاکم قوم مستفید ہوتی ہے اور شخصی حکومت کے زیر تحت قوم کی اکثریت اپنے حق سے محروم رہتی ہے اور صرف امرا اور ان کے مصاحبین ہی قومی ذخائر و خزائن سے منافع حاصل کرتے ہیں۔ آزاد قوموں کی مالی اور سماجی حالت بہتر اور بلند ہوتی ہے۔ حکومت کی مختلف شکلوں اور قسموں کے سلسلہ میں بحث کرتے ہوئے وہ سیاسی زندگی کے اقتصادی محرکات ہی پر زور دیتا ہے۔ میکیاولی کا دعویٰ ہے کہ معاشی حالت پر اس امر کا دار و مدار ہے کہ ایک ملک کے لیے کون سی حکومت بہتر ہوتی ہے اور ارسطو کی طرح وہ اس کو تسلیم کرتا ہے کہ مختلف مقامات اور اوقات میں مختلف نظامِ حکومت زیادہ پائیدار اور سودمند ثابت ہوں گے۔ اس کے قول کے مطابق جمہوریت اور سماجی مساوات کا چولی دامن کا ساتھ ہے: "جہاں جاگیردار ہوں گے وہاں دولتِ عامہ قائم نہیں ہو سکتی اور جہاں مساوات نہیں وہاں دولتِ عامہ نہیں ہو سکتی" اس لحاظ سے میکیاولی پہلا مفکر ہے جو

اس امر پر زور دیتا ہے کہ معاشیات سیاسی زندگی کا سنگِ بنیاد ہے اور مادی فلاح وکامرانی کی خواہش ہی ایک ایسا جذبہ ہے جو اقوام کے سیاسی مد وجزر کا محرک بنتا ہے اور اسی وجہ سے بقول میکیاولی غلام ملکوں اور مفتوح قوموں کے حق میں فاتح جمہوریت کی حکمرانی ایک مطلق العنان فاتح کی حکمرانی سے زیادہ تباہ کن ہے۔ وہ زنجیریں زیادہ سخت اور مضبوط ہوتی ہیں جن سے ایک فاتح قوم اپنے منافع اور مفاد کی خاطر مفتوحہ ممالک کو قید رکھ سکتی ہے کیوں کہ ایسی صورت میں مغلوب ومفتوح قوم کو اپنی جنگِ آزادی میں فاتحین سے من حیث القوم نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ برخلاف اس کے مطلق العنان بادشاہی کی مخالفت میں انہیں فاتح قوم کی اخلاقی ہمدردی حاصل ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ میکیاولی کے نظریات کے مطابق سیاسی زندگی کا محرک مادی خوشی یا خوش حالی ہے اور اس بات کے کہنے یا ثابت کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہتی کہ یہ تصور قرونِ وسطیٰ کے اس نظریہ سے کہ سلطنت کی غرض وغایت انسان کی ابدی نجات کا راستہ صاف کرنا ہے، کس قدر مختلف ہے۔

۶- مذہب اور اخلاقیات

میکیاولی نے اخلاقیات و مذہب کے متعلق جو روش اختیار کی وہ بقول ڈننگ (Dunning) عملی حیثیت سے اس کے اختیار کردہ طریق سے کم اہم نہ تھی اور اس کی شہرت (یا بدنامی) کے قایم کرنے میں اس سے بدرجہا زیادہ موثر تھی .... وہ قانونِ فطرت جسے فلسفۂ قدیم اور فلسفۂ قرونِ وسطیٰ نے علم السیاست کا منبع قرار دیا تھا اور جس میں اس کے حدود معین کیے تھے میکیاولی کے یہاں اس کا سرسری اشارہ بھی نہیں ملتا اور خدا کے قانون کو جہاں تک اس کا اظہار انسان پر براہ راست بذریعۂ الہام ہو، میکیاولی نے اپنے تخیل کی جولان گاہ بنانے اور اپنے فلسفہ کی بحث سے بیک قلم خارج کر دیا تھا۔" مگر وہ مذہب کا مخالف نہیں اور نہ اس کی افادیت و اہمیت کا منکر۔ وہ مملکت کی صحت و بقا کے لیے اخلاقی قوانین اور مذہب کے وجود کو ضروری سمجھتا ہے۔ اس کو اس امر کا بخوبی احساس ہے کہ وہ مملکت کبھی پھل پھول نہیں سکتی جس کی بنیاد و تشکیل صرف خوف و جبر پر ہو۔ شہریوں کی اخلاقی اصلاح اور ان کو سیاسی فرائض اور سماجی ذمہ داریوں سے بخوبی عہدہ برآ ہونے کے لیے خوف و جبر سے زیادہ اسے لطیف اور اعلیٰ محرکات کی ضرورت ہے جو ان کے احساسِ اطاعت اور ان کے جذبۂ ایثار کو جلا دیں۔ اور اس نقطۂ نگاہ کے تحت مملکت کی بہبود و استحکام کے لیے مذہب کا وجود نہایت اہم اور مفید ہے مگر اسی مفروضہ کے مطابق مذہب اور اخلاق کی اصلیت و اہمیت بظاہر اس کے سوا کچھ نہیں رہ جاتی کہ وہ مملکت اور حکومت کے رہبر اور حاکم ہونے کے بجائے ان کے آلۂ کار رہیں اور اس لحاظ سے کلیسا کا مرتبہ حکومت کے ایک شعبہ سے زیادہ نہیں۔ لیکن یہ عام خیال غلط ہے کہ میکیاولی اخلاقیات

یا حق و ناحق اور حسن و قبح کی تعریف کا قائل نہ تھا۔ "حکمراں" اور "مقالات" سے کے سرسری مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ وہ اخلاقی قدروں کو تسلیم کرتا تھا اور فی نفسہ اس کو مکر و فریب، ظلم اور ناانصافی سے کوئی لگاؤ یا رغبت نہ تھی۔ "حکمراں" میں وہ بار بار اور صاف صاف کہتا ہے "ساتھی شہریوں کو قتل کرنا، دوستوں کو دھوکہ دینا، اپنا اعتبار کھو بیٹھنا، رحم نہ کرنا اور مذہب کو خیرباد کہنا کوئی تعریف کی بات نہیں۔ ان ذرائع سے سلطنت مل جائے تو مل جائے لیکن ناموری حاصل نہیں ہوا کرتی۔"

آگاتھوکلیز (Agathocles) کے عزم و استقلال اور ہوشمندی اور سیاسی تدبیر کی تعریف کرنے کے باوجود میکیاولی کا قول ہے کہ "اس کی انتہائی ظلم و بے رحمی اور اس کے بے شمار جرائم اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ اس کا شمار عظیم ترین شخصیتوں میں کیا جائے۔"

اخلاقی اصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے وہ باب ۱۸ میں کہتا ہے کہ ہر شخص کو اس سے اتفاق ہوگا کہ "بادشاہ کے لیے عہد و پیماں پر قائم رہنا، راست بازی اختیار کرنا اور دغا فریب سے کنارہ کشی کرنا بہت ہی قابلِ تعریف ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ میکیاولی مذہب و اخلاق کا منکر یا ان سے باغی نہ تھا اور اس کی تعلیمات اور نظریات کو شیطانیت کے مترادف قرار دینا ناانصافی ہے۔ اس سلسلہ میں اگر اس امر کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ میکیاولی حبِ وطن اور اطالوی اتحاد کا دل و جان سے قائل تھا اور کلیسا کا مذہبی اقتدار، پوپ کی سیاسی قیادت اور کلیسا کے مقبوضات تحریکِ اتحاد و آزادی کی راہ میں اس وقت سب سے بڑی رکاوٹ بنے ہوئے تھے تو میکیاولی کا نقطۂ نگاہ بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔ وہ مذہب کو نہیں، کلیسا کے اقتدار کو مٹانا چاہتا تھا۔ وہ اخلاقیات کا منکر نہیں بلکہ پوپ کی سیاسی قیادت کا مخالف تھا۔ اور اس ضمن میں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ جس ماحول میں میکیاولی نے پرورش پائی اور جن سیاسی حالات و حادثات سے اس کا سابقہ پڑا، وہ کیا تھے۔

اطالیہ کی پندرھویں صدی کی عمرانی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم پر بقول جانسن

"دو حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اولاً آزادی و حریت کے مٹ جانے اور سیاسی فرقہ بندیوں سے قوم کی اخلاقی زندگی پر مہلک اثرات کا پھیلنا، ثانیاً عیش و عشرت اور ایسے علوم و فنون میں منہمک ہو جانے کے نتائج جن میں مذہب کا پاکیزہ عنصر موجود نہ ہو ..... اصول کی پابندی اور احکام کی بجا آوری کی جگہ کامیابی کی پرستش ہونے لگی اور نیکی کی جگہ سفاکی اور خود غرضی نے لے لی۔ میلان (Milan) اور نیپلز (Naples) جیسی ریاستوں میں جہاں تمام سیاسی حریت فنا ہو چکی تھی، مظلوموں کے ہاتھوں میں صرف وہی سازش اور کشت و خون کے حربے رہ گئے تھے جن کے سبق انہوں نے اپنے جابر حکمرانوں سے سیکھے تھے... ہر شخص ہر وقت اس دھن میں غلطاں و پیچاں رہتا تھا کہ خفیہ سازشوں اور اعلانیہ بغاوتوں سے یا جس طرح بنے اپنے دشمنوں اور حریفوں کی بیخ کنی کرے؟"

مفکرین یونان کی طرح وہ اس نظریہ کا قائل تھا کہ افراد کی بہبود کے لیے مملکت کا وجود لازمی ہے کیونکہ باہمی اور باضابطہ اتحاد عمل ہی سے انسانی اور عمرانی زندگی کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ مشہور مفکر و مدبر ایڈمنڈ برک (Edmund Burke) کے الفاظ میں "مملکت صرف ان اشیاء میں شرکت کا نام نہیں جو ایک عارضی اور فانی نوعیت کے ساتھ محض خالص حیوانی وجود کے ماتحت ہیں۔ بلکہ تمام علوم میں شرکت، تمام فنون میں شرکت اور ہر نیکی میں شرکت اور ہر کمال میں شرکت کا نام مملکت ہے" وہ مملکت کی اہمیت اور افادیت کو بالذات تسلیم کرتا ہے اور اس لیے سیاسی مصلحت (Reason of State) کو اخلاقی اصولوں سے کمتر تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اس کی رائے میں فرد کو مملکت کا مترادف قرار نہیں دیا جا سکتا کیوں کہ فرد عام طور پر ناشکر گذار، کم ور طبع، دغا باز، بزدل اور حریص ہونے کی وجہ سے ذاتی منفعت کا طالب ہوتا ہے۔ لیکن مملکت کا منشاء عام لوگوں کی فلاح و بہبود ہے۔ مملکت کے اپنے کوئی جداگانہ اغراض ہوتے ہیں نہ مقاصد۔ اس لیے سیاسی زندگی میں مملکت کو ان اخلاقی اصولوں اور قوانین کا تابع و پابند نہیں کیا جا سکتا جو روزمرہ کی زندگی میں عوام الناس کے درمیان رائج ہیں۔ اصل چیز مقصد ہے اور جائز مقصد کے لیے ہر طریقہ اور ہر

ہتھیار کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ قومی مفاد یا مقاصد کی برتری یا حفاظت کے لیے اگر اس کی نوبت آجائے کہ حکمراں یا سیاست داں کو اخلاقی ضابطوں کو خیر باد کہنا ناگزیر ہو جائے تو اس کے لیے یہ مناسب اور جائز ہے کہ وہ مفاد عامہ کی خاطر اخلاقیات کو پسِ پشت ڈال دے۔

"جب تک ممکن ہو نیکی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے مگر جب اسے ترک کرنا ضروری ہو تو یہ بھی بے باکی کے ساتھ کرے۔"

کیونکہ بقول میکیاولی "ہمارے زمانہ میں جو واقعات پیش آئے ہیں ان میں خود ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ایسے بادشاہوں نے جنہوں نے عہد و پیماں کی کبھی پروا نہ کی اور دوسروں کو دھوکہ اور فریب سے نیچا دکھایا، بڑے بڑے کارہائے نمایاں کیے ہیں اور وہ بادشاہ ان بادشاہوں سے کہیں بہتر ہیں جنہوں نے راست بازی کو اپنا شعار بنایا۔" (باب ۱۸)

یہ ہے وہ اصول اور نظریہ جس کی بنا پر میکیاولی موردِ طعن وطن اور آماج گاہِ دشنام ہوا۔ ایک غیر ذمہ دار فلسفی کی حیثیت سے فریڈرک اعظم نے عالم نوجوانی میں "حکمراں" کی تردید اور مخالفت میں "ردِ میکیاولی" (Anti Machiav — elli) لکھا لیکن جب تاج و تخت ملا اور سیاسی گرداب میں پھنسی ہوئی کشتی سلطنت کی ناخدائی کرنی پڑی تو اس نے بھی بے چون و چرا میکیاولی کے نظریات کو اپنایا اور دنیائے سیاست نے اس کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مورخین نے اس کے کارناموں کو سراہا اور اسے "فریڈرک اعظم" کے لقب سے نوازا۔

کاؤنٹ کیور (Count Cavour) کا شمار بجا طور پر معماران اطالیہ میں ہوتا ہے۔ لیکن اس کی حکمت عملی کا سنگِ بنیاد وہی نظریہ تھا جو میکیاولی نے سولھویں صدی میں پیش کیا تھا اور جس کی بنا پر وہ موردِ الزام قرار پایا۔

اس سلسلہ میں یہ بات ذرا غور طلب ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی کے بعض نہایت ہی موقر اور متبحر مورخین اور سیاسی مفکرین نے میکیاولی کا مطالعہ بہ نظر غائر کیا اور اس کے معاصرین کے برعکس اس کی فکر و نظر کو سراہا

اورمیکیا ویلی کو اس طرح سے "خراجِ عقیدت" پیش کرنے والوں میں لارڈ ایکٹن (Lord Acton) ، رانکے (Ranke) ، مائینکے (Friedrice Meinecke) اور کاونٹ اسفورزا (Count Carlo Sforza) ایسی موقر ہستیاں ہیں جن کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عملی سیاست میں ان کا نقطۂ نظر قسطائی ([illegible]) ہے۔ ایکٹن کے برل اور ترقی پسند ہونے میں کسی کو کلام نہیں اور مائینکے اور اسفورزا کا شمار ان واجب التعظیم ہستیوں میں ہے جنہوں نے ہٹلر اور مسولینی کے جابرانہ نظامِ حکومت کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا۔

"ہماری زندگی کا انداز جیسا ہے اور جیسا ہونا چاہیے، ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اور جو بھی دوسرے کو اختیار کرنے کی خاطر پہلے کو چھوڑ دیتا ہے وہ نجات کی بجائے اپنی تباہی کی صورت پیدا کر لیتا ہے۔ اس لیے کہ ایسی دنیا میں جہاں تمام انسان نیک نہ ہوں، ہر معاملہ میں کامل نیکی کو اپنا معیار بنانا اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنا ہے۔ جس حکمران کا حکومت سے جی کھٹا نہ ہو گیا ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ نیکی علاوہ اور بھی کچھ سیکھے اور نیکی کا استعمال موقع محل کے لحاظ سے کرے"

"لوگ تو اکثر بے ایمان ہوتے ہیں۔ وہ اپنی بات پر قائم نہیں رہتے تو حکمران کیوں سختی کے ساتھ عہد کی پابندی کرے"

یہ ہیں وہ وجوہ جن کی بنا پر میکیا ویلی سیاسی اور نجی زندگی کے اخلاقی معیاروں میں تفریق کا قائل ہے۔ اپنے مطالعہ اور تجربات کی بنا پر وہ عوام الناس سے بدظن تھا۔ اور اسی لیے بار بار اس کا اعادہ کرتا ہے کہ ایک سیاست داں، ان تمام اصولوں پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا جو انسان کو نیک خصلت سمجھ کر واضع کیے گیے ہیں۔ مملکت کو برقرار رکھنے کے لیے وہ اکثر مجبور ہو جاتا ہے ایفائے عہد، نیکوکاری اور دین داری کو خیرباد کہے، اس لیے اپنے رویہ میں تبدیلی کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔" اس نظریہ کو اس نے "مقالات" میں زیادہ وضاحت سے یوں پیش کیا ہے:

"جب ملک کے تحفظ کا مسئلہ پیش آجائے تو پھر اس کا لحاظ نہ ہونا چاہیے کہ کون امر جائز ہے اور کون ناجائز، کون رحیمانہ ہے اور کون ظالمانہ، کون شاندار اور شرمناک۔ اس موقع پر سوائے اس روش کے جو ملک کی زندگی بچا سکے اور اس کی خود مختاری قایم رکھ سکے اور تمام امور کو ساقط کر دینا چاہیے"

مملکت کا قیام اور قومی آزادی مقصود بالذات ہیں اور اس لیے سیاست داں کو چاہیے "اپنے کو اخلاص، صداقت، انسانیت اور مذہب کا مجسمہ ظاہر کرے اور واقعی ہو بھی ایسا۔ مگر اسے اپنے دل کو اس طرح قابو میں کر لینا چاہیے کہ جب مملکت کو بچانے کی ضرورت ہو تو وہ ان سب سے بے پروا ہو کر عمل کر سکے"۔ مگر "حکمراں" کے آخری باب میں اطالیہ کی آزادی اور قومی اتحاد کے لیے پرجوش نعرہ لگاتے ہوئے وہ اخلاقیات کا ہی سہارا ڈھونڈتا ہے۔ "ہمارا مقصد انصاف پر مبنی ہے اس کے لیے جو جنگ ضروری ہو اس کی بنا انصاف پر ہے اور جن اسلحہ سے ساری امیدیں وابستہ ہوں وہ متبرک ہیں"

مادرِ وطن کی آزادی اور ملی مفاد کی خاطر ہر محب وطن بڑی سے بڑی قربانی کے لیے تیار رہتا ہے۔ بین الاقوامی سیاست کا یہ پہلا اور سب سے اہم اصول ہے کہ قوم و ملک کا مفاد ہر شے پر مقدم ہے اور ہر بیدار حکومت بلا تخصیص مذہب و ملت رنگ و نسل اپنے قومی مفادات کا حتی الامکان تحفظ کرتی ہے۔ امن کے زمانے میں بذریعہ ڈپلومیسی اور جنگ کے دوران بذریعہ کشت و خون۔ یہی وہ جذبہ و جوش ہے کہ جس کے تحت میکیاولی قومی آزادی اور ملی مفاد کو ہر قسم کے قیود و ضوابط پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ اس کے نزدیک حق و ناحق، حسن و قبح، ظلم و انصاف کوئی معنی نہیں رکھتے، اس کے مفروضہ کے مطابق ہر مقصد جائز نہیں اور ہر جائز مقصد کے لیے ہر ہتھیار۔ اس کی تشریح کے مطابق جائز مقصد کو حاصل کرنے لیے ہر وہ طریقہ یا حربہ جس کا استعمال ناگزیر ہو اور جس سے کامیابی یقینی ہو، جائز ہے اور وہ مقاصد صرف قومی آزادی اور مفاد عامہ ہیں جن کی حفاظت اور حصول کے لیے ہر طریقہ اور ہر ہتھیار استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسی امر کو وہ "مقالات" کے باب "ایں بیانگِ دہل

واضح کرتا ہے۔

"جب کسی نازک گھڑی میں ملک کے تحفظ کا دار و مدار فقط ایک فیصلہ پر ہو تو اس فیصلہ تک پہنچنے میں انصاف یا ناانصافی، انسانیت یا بہیمیت، عزت یا ذلت کے سوالات کو قطعاً داخل نہیں ہونے دینا چاہیے۔ بلکہ ان سب سوالات کو پس پشت ڈال کر محض ایک سوال سامنے ہونا چاہیے: ملک کی بقا اور اس کی آزادی کی حفاظت کے لیے کون سا راستہ اپنایا جائے؟" اس طرح میکیاولی تعلیم دیتا ہے کہ "ایک اچھے شہری کو اپنے ملک کی محبت میں اور اس کے مفاد کی خاطر اپنی ذات کے ساتھ ہوئی ذلتوں اور ناانصافیوں کو فراموش کر دینا چاہیے" (مقالات باب ۴۷)۔

نظریہ سیاسات کے مورخوں کے بموجب، میکیاولی نے اخلاقیات و مذہب کی جانب جو روش اختیار کی وہ علمی حیثیت سے اس کے اختیار کردہ تاریخی طریق سے کم اہم نہ تھی اور اس کی شہرت کے قایم کرنے میں اس سے بدرجہا زیادہ موثر تھی۔ میکیاولی کا تعارف اس سے بہترین طریق پر ہوتا ہے اور اس سے یہ اظہار ہوتا ہے کہ اس کا (میکیاولی کا) نظریہ سیاست قرونِ وسطیٰ میں رائج شدہ نظریہ سیاست سے قطعی طور پر جداگانہ تھا۔ قرونِ وسطیٰ کا سیاسی نظریہ تاریخ کا کچھ نہ کچھ لحاظ کرتا تھا اور مفکّرین خصوصیت کے ساتھ بعض مسلّمہ اصولوں کی تائید کم و بیش گذشتہ حوالہ سے کرتے تھے۔ قرونِ قدیم یا قرونِ وسطیٰ کے کسی فلسفی کے نزدیک مذہب اور اخلاقیات کے احکام سیاست کے نظریہ اور عمل کے اعتبار سے اتنے پست بلکہ حقیر درجہ پر نہیں پہنچائے گئے تھے جیسا کہ میکیاولی کا خیال تھا۔

وہ قانونِ فطرت جسے فلسفہ قدیم اور فلسفہ قرونِ وسطیٰ نے علم السیاست کا منبع قرار دیا تھا اور اس کے مطابق سیاست کے حدود معین کیے تھے، میکیاولی کے یہاں اس کا سرسری اشارہ بھی نہیں ملتا اور خدا کا قانون جہاں تک کہ اس کا اظہار انسان پر براست الہام کے ذریعہ ہوا ہے وہ میکیاولی کے میدانِ تخیل سے خود خارج سمجھ لیا گیا تھا۔

میکیاولی حضرت موسیٰ کو ایک زبردست تاریخی شخصیت مانتا تھا لیکن بقول ڈننگ (Dunning) اس نے "حکمراں" باب ششم میں صرف اس لیے خارج از بحث کر دیا کہ وہ ہدایت الٰہی کے بموجب عمل کرتے تھے، جو وجہ حضرتِ موسیٰ کو دوسرے کے فلسفہ میں بحث کا مرکز بنا دیتی ہے وہی آپ کو میکیاولی کے فلسفہ کی بحث سے خارج کر دیتی ہے۔"

اس موقع پر اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ نظریہ سیاسیات کی تاریخ میں میکیاولی پہلا مفکر ہے جس نے اخلاقیات اور سیاست کے تضاد کو محسوس کیا۔ یہ غلط فہمی مغربی دانشوروں کی اس خوش فہمی کا لازمی جز وا ورشاخسانہ ہے کہ سیاسی فکر و نظر کا ارتقاء مغرب کا مرہونِ منت ہے اور مشرقی ذہن اس نا بلد تھے

میکیاولی سے بہت پہلے مشرق کے بعض مفکرین نے اخلاقیات اور سیاست کے تضاد کو محسوس کیا تھا۔ قدیم ہند کے مفکر کوٹلیا نے اپنی مشہور و معروف تصنیف "ارتھ شاستر" میں، امیر کیکاؤس نے "قابوس نامہ" میں، ابنِ طقطقی نے اپنی کتاب "الفخری" میں اور ضیاالدین برنی نے "فتاویٰ جہاں داری" میں اپنی اپنی سمجھ اور ماحول کے مطابق ان عملی مسائل و مشکلات کو موضوع بحث بنایا جن سے حکمرانوں کو دوچار ہونا پڑتا ہے اور وہ سب کے سب اس نتیجہ پر پہنچے کہ مذہب و اخلاقیات کے مطالبات اور سیاست کے تقاضوں میں بنیادی تضاد ہے جسے رفع کرنا بظاہر ممکن نہیں۔ بقول ضیاالدین برنی "حکومت دنیاداری کی آخری منزل ہے اور دین داری کے ساتھ نہیں چل سکتی۔" امیر عنصرالمعاری کیکاؤس بن سکندر (۱۰۲۱ء تا ۱۰۸۲ء) زیاری خاندان کا ایک مشہور فرماں روا گذرا ہے۔ "قابوس نامہ" میں اس نے اپنے بیٹے گیلان شاہ کو اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا اور اپنے علم و تجربات کی روشنی سیاست و زندگی کے حقائق سے آگاہ کیا۔

بقول پروفیسر براؤن "قابوس نامہ" نے وسیع شہرت حاصل کی اور حقیقت میں یہ کتاب اس شہرت کی مستحق بھی تھی، کیونکہ یہ لطائف اور حکمتوں سے پر ہے، مثالوں اور حکایتوں کا مرقع ہے اور ایک بادشاہ کی تصنیف ہے جس نے اپنے تجربات نہایت بے باکانہ انداز میں بیان کر دیے ہیں:

صفی الدین بن علی بن طباطبا المعروف بہ ابن طقطقی ۱۲۶۲ء میں پیدا ہوا، ۱۲۹۷ء میں بغداد آیا، تین سال قیام کرنے کے بعد وہ تبریز کے لیے روانہ ہوا، برف باری کی شدت اور موسم کی خرابی کے باعث اسے موصل میں رکنا پڑا۔ فروری تا جون ۱۳۰۲ء وہ حاکم موصل فخر الدین عیسٰی بن ابراہیم کا مہمان تھا۔ اسی قیام کے دوران اس نے اپنی کتاب "الفخری" لکھی جس میں جہاں بانی اور سیاست کے اصول نہایت دل پذیر انداز میں بیان کیے اور تاریخی واقعات و حوالوں کی روشنی میں ان کی وضاحت کی:

"بادشاہ کو چاہیے کہ ایسے شخص کو جسے سرد مہری یا پیشانی کی شکن سے ٹھیک کیا جا سکے اسے دھمکی نہ دے اور جسے صرف دھمکی ہی راہ راست پر لگا دے اسے قید و بند کی صعوبت میں ڈالنا قرینِ عقل نہیں ہے اور جسے قید کرنا کافی ہو اسے درے لگوانا مناسب نہیں، اور جسے دُرے ٹھیک کر سکیں اُسے قتل کرنا عقلمندی نہیں۔"

اگر غور و فکر کے بعد بادشاہ یہ ضروری سمجھے کہ قتل کے سوا کوئی چارہ نہیں تو اس فیصلہ کو نہایت استقامت اور ہوشیاری سے عملی جامہ پہنائے کیوں کہ ایک شخص کو قتل کر دینا زیادہ بہتر ہے کہ اسے آزاد چھوڑ کر حالات اس قدر خراب ہونے دیے جائیں کہ بعد میں پانچ آدمیوں کو قتل کرانا پڑے، اور پانچ آدمیوں کو قتل کرا دینا کہیں بہتر ہے کہ (نرمی یا سستی کی وجہ سے) حالات رفتہ رفتہ بے قابو ہو جائیں اور پھر اصلاح کے لیے سو آدمیوں کو قتل کرانا ناگزیر ہو جائے۔"

ان سب نظائر کے باوجود میکیاولی کے سیاست و اخلاق کی علیحدگی کے نظریہ سے جو مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں ان سے انکار ممکن نہیں، اخلاقی اصولوں کی خلاف ورزی کا نظریہ اس بنیادی اصول کا منافی ہے جو عمرانی زندگی اور سیاسی زندگی دونوں ہی کا سنگ بنیاد ہے۔ یعنی سماجی زندگی افراد کی اخلاقی تربیت کا ایک ذریعہ ہے اور یہ کہ مملکت بذاتِ خود مقصد نہیں بلکہ معاشرے کی اخلاقی اور روحانی نشوونما کے لیے محض ایک ذریعہ ہے۔ اور اسی

مقصد کے اعلیٰ ترین تصور کی نشاندہی ہمیں افلاطون کی عینی مملکت میں ملتی ہے
اپنی شہرہ آفاق تصنیف "مملکت" (Republic) میں افلاطون نے
عینی مملکت کا جو خاکہ پیش کیا تھا اس کے لحاظ سے عمرانی اور سیاسی زندگی کا مطمح
نظریہ ہونا چاہیے کہ افراد کو اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع ملے اور "حق
بحقِ دار رسید" کے مطابق کسی فرد کے بھی حقوق نظر انداز نہ ہو سکیں۔ اور ایسے
نظامِ زندگی کے لیے یہ ضروری ہے کہ سیاسی اقتدار ایسے مدبروں کے ہاتھ
میں ہو جو نہ صرف دانشمند اور دور اندیش ہوں بلکہ دیانت دار بھی ہوں اور ان
کے دل و دماغ "خیر کے تصور" سے منور ہوں۔ مملکت میں کامل ربط اور ہم آہنگی
اس وقت ہو سکے گی جب حکومت ایسے مدبروں کے ہاتھ میں ہو جو کامل نیکی یا
خیر سے ممیز ہوں اور حقیقی معنوں میں انسان کی ہستی کے راز اور اس کے وجود
کے مقصد سے واقف ہوں۔

افلاطون کے اپنے الفاظ میں "شہروں (مملکتوں یا (Polis) کو بلکہ
نوعِ انسانی کو اپنے مصائب سے اس وقت تک نجات نصیب نہ ہو گی جب تک
سیاسی عظمت اور عرفانِ حقیقت میں دونوں یکجا نہ ہو جائیں اور وہ عامیانہ
طبائع جو ان میں صرف ایک کی ابتدا کرتے ہیں اور دوسرے کو چھوڑ دیتے ہیں
علیحدہ ہونے پر مجبور کیے جائیں۔" مگر مشکل تو یہ ہے کہ علم کی دنیا میں خیر کا
تصور سب سے آخر میں آتا ہے اور پھر بھی بڑی کوشش سے دکھائی دیتا ہے
ہاں جب یہ دکھائی دے جاتا ہے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمام حسین اور صحیح
چیزوں کا باعث ہے ۔۔۔ اور جو کوئی شخصی یا اجتماعی زندگی میں عقل کے مطابق
عمل کرنا چاہتا ہے اسے اپنی نگاہ اس پر قائم رکھنی چاہیے۔"

دینی انحطاط اور دینی اصول و اخلاق کے زوال کی وجہ سے اور قومیت و وطنیت
کے طرزِ خیال کے فروغ سے معاشرتی زندگی اور بین الاقوامی سیاست پر جو
اثرات مرتب ہوئے ان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مشہور انگریز فاضل لارڈ
لوتھین (Lord Lothian) نے ایک موقع پر فرمایا کہ "دین
جو انسان کا ضروری رہنما، اخلاقی مقصد کے حصول اور انسانی زندگی کی عزت

اور معنویت کا واحد ذریعہ ہے اس کے اقتدار کے زوال کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی دنیا ایسے سیاسی مذاہب و خیالات کی گرویدہ ہو گئی جن کی بنیاد نسل اور طبقات کے اختلاف پر ہے۔ علوم طبعی کے اثر سے اس نے یہ تسلیم کر لیا کہ مادی ترقی ہی اعلیٰ مقصد ہے۔ اس وجہ سے زندگی کی مشکلات اور اس کی الجھنیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ یورپ کے لیے اپنی روح اور زندگی کے درمیان ایسی تطبیق دینا مشکل ہو گیا جو اس عصر کی سب سے بڑی مصیبت قومیت سے نجات دلا سکے "۔

خالص قوم پرستانہ ذہن اور اس کے طریقۂ کار کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی فکر انگیز تصنیف (A Guide to Modern Wickedness)

میں پروفیسر جوڈ (Professor C.E.M. Joad)

نے قوم پرستی کی غالباً سب سے دکھتی رگ کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا۔ "وہ مشترک جذبات جن کو آسانی سے برانگیختہ کیا جا سکتا ہے اور وہ جو جمہور کی بڑی بڑی جماعتوں کو حرکت میں لا سکتے ہیں وہ رحم، فیاضی اور محبت کے جذبات نہیں بلکہ نفرت اور خوف کے جذبات ہیں۔ جو لوگ کسی قوم پر کسی مقصد کے لیے حکمرانی کرنا چاہتے ہیں وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک وہ اس کے لیے کوئی ایسی شخصیت یا قوم نہ پیدا کر لیں جس سے وہ ڈرتے رہیں۔ اگر قوموں کو متحد کرنا چاہوں تو مجھے چاہیے کہ میں ان کے لیے کسی اور سیارہ پر کوئی دشمن ایجاد کر دوں۔ مثلاً چاند پر، جس سے یہ سب قومیں ڈریں۔ اس بنا پر یہ قطعاً حیرت کی بات نہیں کہ اس زمانہ کی قومی حکومتیں اپنی ہمسایہ قوموں کے ساتھ معاملہ کرنے میں نفرت اور خوف ہی کے جذبات کے زیر اثر ہیں۔ انہیں جذبات پر ان سلطنتوں پر حکمرانی کرنے والوں کی زندگی موقوف ہے اور ان ہی جذبات پر قومی اتحاد کی بنیاد ہے "۔

سیاست سے اخلاق کی علیحدگی کے نتیجے میں عمرانی اور سیاسی زندگی میں جو مضر اثرات مرتب ہوئے ہیں ان کا تجزیہ کرتے ہوئے شاعر مشرق نے عصری تہذیب کے جس المیہ کی نشان دہی کی وہ عہد حاضر کے لیے ایک سوالیہ نشان کی حیثیت رکھتا ہے۔

۷-قومیت اور اطالوی اتحاد

پندرہویں اور سولہویں صدی میں یورپ کے مغربی ممالک میں طاقتور مرکزی حکومتیں قائم ہو رہی تھیں۔ انگلستان میں ہنری ہفتم اور ہشتم (Henry-VII & Henry VIII)، فرانس میں لوئی یازدہم (Louis — XI) نے، اسپین میں فرڈی نند اور ازبیلا (Ferdinand; Isabella) نے اپنی حکمتِ عملی اور چابک دستیوں سے جاگیردارانہ نظام کو ختم اور طبقۂ امراء کے اثر اور اقتدار کو کم کر دیا تھا اور ایک بادشاہ کی بادشاہی کو اصولاً اور عملاً رائج کر دیا تھا۔ سیاسی وحدت نے جذبۂ قومی کی داغ بیل ڈالی کیوں کہ ایک ہی مملکت کی وفاداری، ایک ہی قانون کی اطاعت اور ایک ہی فرماں روا کی فرماں برداری نے ملک اور ملک کے تمام باشندوں کو ایک مشترک نظم و نسق کے رشتہ میں منسلک کر دیا تھا۔

مشترک زبان کا استعمال، مشترک ادب سے دلچسپی، مشترک رسم و رواج، زمانۂ ماضی کے مشترک قومی کارنامے، اور مشترک مقاصد ایسے رابطے ہیں جو احساسِ جمعیت پیدا کرتے ہیں اور افراد میں تعامل و تعاون کا جذبہ بیدار کر کے ان میں اپنی جداگانہ تمدنی و سیاسی حیثیت کا اعتراف پیدا کرتے ہیں۔ عہدِ وسطیٰ کے جاگیردارانہ نظام اور پوپ کے روحانی اور سیاسی اقتدار نے یورپ کی قوموں اور نسلوں کو متحد کر دیا تھا اور تمام مسیحی دنیا میں یگانگت اور یکسانیت کا دور دورہ تھا۔ پوپ کا سیاسی مطمحِ نظر آفاقیت تھا لیکن جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے تحریک نشاط الثانیہ یا احیاء علوم و فنون (Renaissance) نے قومی کلچر اور تحریکِ مذہبی اصلاح (Reformation) نے

قومی تہذیب کی آب یاری کی اور سیاسی و تمدنی شخصیت کی دنیا کے نظامِ وحدت کو پارہ پارہ کر دیا۔

قدیم یونان اور جمہوری روم کی تاریخ کے مطالعہ سے مغربی یورپ میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہوا تھا لیکن سیاسی ماحول اور اقتضائے وقت کی وجہ سے اس جذبہ نے قوم پرستی کا رنگ و روپ اختیار کر لیا۔

اس موقع پر غالباً یہ اشارہ بے محل نہ ہوگا کہ قدیم یونان اور روم میں سیاست اور وطنیت کو اس قدر اہمیت حاصل تھی کہ اخلاق، علم، معاشرت غرض کہ زندگی کے ہر شعبہ میں حب الوطنی کا خیال اور سب خیالات کے اوپر چھایا ہوا تھا۔ بڑے سے بڑے حکماء، بڑے سے بڑے شعراء، بڑے سے بڑے اہل علم اور فاضل بڑے سے بڑے اربابِ فکر و تصنیف، بلحاظ اپنے پیشے کے سپاہی یا اہلِ سیاست ہی ہوتے تھے۔ اس حالت کا قدرتی اقتضاء یہ تھا کہ فضائل اخلاق کی عمارت فضائلِ سیاسی ہی کی بنیاد پر قایم ہو اور مفکر جتنے نظریات قایم کرتے تھے اُن سب کی تہ میں سیاسی مصلحت اندیشیاں ہی کام کرتی نظر آتی تھیں۔ افلاطون نے تعدد ازدواج کی محض اس بنا پر حمایت کی کہ ملک میں قوم پرستوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ ارسطو کا سارا نظام اخلاق یونانی اور غیر یونانی کی تفریق پر مبنی تھا۔ اور اجماع مفکرین سے فضائل اخلاق کی جو فہرست تیار کی گئی تھی اس کا عنوانِ اولین حب الوطنی تھا۔

عام اتفاق اس پر تھا کہ حب الوطنی ایک اخلاقی فرض ہے اور فرض بھی ایسا کہ تمام دوسرے فرائض کا سرتاج۔ سسرو کا یہ قول اس کے ذاتی خیال نہیں بلکہ اس کے معاصرین کے عام احساس و عقیدہ کا ترجمان ہے کہ "وطن کی محبت کو تمام اعزہ کی محبت پر غالب و فائق ہونا چاہیے، اور جو شخص حب الوطنی میں اپنی جان دینے کو آمادہ نہیں اسے کوئی حق نہیں کہ وہ دنیا کے سامنے اپنی فضیلتِ اخلاق کو پیش کر سکے"۔ رومی مذہب کی نوعیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لیکی (E.H.P. Lecky) نے تاریخِ اخلاق یورپ (History — of European Morals) میں اس امر پر زور دیا کہ:

یہ لوگوں کو پابند اخلاق رکھنے میں بے شبہ بہت کچھ معاون تھا لیکن اس سے کوئی اخلاقی جذبہ نہیں پیدا رہتا تھا۔ یہ تمام تر سیاست کی پیداوار تھا اور اس کی جو کچھ طاقت تھی وہ سب سیاسی رنگ میں رنگی ہوئی تھی" اور اس کا بقول لیکی کے یہ اثر تھا کہ اگرچہ روم میں سینکڑوں ہیرو اور جانباز پیدا ہوئے لیکن نفس کش زاہد ایک بھی نہ ہوا۔ ایثار کی جو بہتر سے بہتر مثالیں قدیم روم کی تاریخ میں ملتی ہیں وہ وطن پرستی پر مبنی مگر مذہب کے اثر سے آزاد تھیں۔

زمانۂ قدیم میں ریاستیں شہری (Policor City State) ہوتی تھیں اس لیے یہ جذبہ محدود رہتا مگر نشاۃ ثانیہ اور تحریکوں کے دور عروج میں مملکتیں ملکی اور قومی (National and Territorial) ہونے لگی تھیں اور اسی لیے اس جذبہ کی نوعیت میں بڑی تبدیلی اور وسعت ہوئی۔

افکار و خیالات، زبان و ادب، اخلاق و سماج اور تاریخ و روایات کی یکسانیت کی بنا پر "افراد" ایک "قوم" متصور ہونے لگے اور ان کے لیے یہ ضروری خیال کیا جانے لگا کہ وہ سیاسی حیثیت سے اپنی آزاد مملکت بھی رکھتے ہوں۔

دانتے اور مازینی کی طرح میکیاولی میں بھی حب الوطنی کا جذبہ موجزن تھا۔ اس نے اپنی یا اطالوی قوم کی پراگندگی، احساسِ کمتری اور تباہ حالی کے مناظر دیکھے تھے اور اس کی حساس طبیعت کو یہ امر حد درجہ ناگوار تھا کہ اطالیہ جو تحریک احیاء علوم کا مخزن اور سرچشمہ ہونے کی حیثیت سے یورپ کا رہبر تھا سیاسی طور سے قعرِ مذلت میں جا پڑا تھا۔ اور جغرافیائی اصطلاح سے زیادہ کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ بقول ویکمن (Wakeman)

"اطالیہ کا ان دنوں وجود ہی نہ تھا" اس وقت اطالیہ چھوٹی چھوٹی کمزور اور آزاد ریاستوں میں بٹا ہوا تھا جو قدیم یونان کی طرح عام طور سے شہری ریاستیں (City States) تھیں اور جن کے وسائل محدود تھے۔ ان ریاستوں میں میلان، وینس (Venice)، فلورنس، نیپلز اور

ریاستہائے کلیسا Papal States خصوصاً قابلِ ذکر ہیں ان کا
ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ فلورنس اور وینس کی طرح بعض ریاستوں کا نظامِ
حکومت جمہوری تھا اور بعض میں شخصی مطلق العنانی کا ان ریاستوں میں تعاون
اور اتحاد نام کو بھی نہ تھا۔ ملک گیری کی ہوس اور سیاسی اختلافات کی وجہ
سے باہمی رقابت اور سازشوں کا میدان گرم تھا۔ لیکن ان ریاستوں میں
کوئی بھی اتنی طاقتور اور مضبوط نہ تھی کہ دوسروں کو زیر کر کے سارے
اطالوی جزیرہ نما میں ایک وحدانی حکومت قایم کر سکے یا اس کی سر
کردگی میں سب ریاستیں وفاقی نظام کے ذریعہ شیر و شکر ہو کر ایسا محاذ قایم
کر سکیں جو اطالیہ کو بیرونی مداخلت اور "وحشی حملہ آوروں" کی دست
برد سے محفوظ و مامون رکھ سکے۔ جانسن کے الفاظ میں "ان کی قوتوں کا
توازن اس قدر مساوی تھا کہ کسی ایک کا پلہ بھاری نہ ہونے پاتا تھا۔ ان
کے باہمی رشک و حسد کا جذبہ اتنا قوی، ان کے باشندوں کے اوضاع واطوار
ایک دوسرے سے ایسے متضاد اور ان کی حکومتوں کی تشکیل باہم دگر ایسی
متواتر تھی کہ عہد و میثاق کا کوئی رشتہ ان کو متحد کر ہی نہ سکتا تھا مشترکہ قومی مفاد
کا احساس ان کے دلوں سے مٹ چکا تھا" قومی اتحاد کی راہ میں سب سے
بڑی رکاوٹ پوپ کا دنیاوی اعزاز و سیاسی اقتدار تھا۔ نکولس پنجم،
(Nicholas V) سیکٹس چہارم (Sextus IV) ، الیگزانڈر
ششم (Alexander VI) اور جولیس دوم (JuliusII)
کی انتھک کوششوں اور حکمتِ عملی کی بدولت پوپ کا شمار بھی اطالیہ کے
ملوک الطوائف میں ہونے لگا تھا۔

"شہروں اور صوبوں کے وہ تمام مجموعے جو اتفاق و اتحاد کے طرف مائل
تھے، ان میں اطالیہ نے سب سے کم ترقی کی تھی۔ تقریباً تین سو برس تک جزیرہ
نمائے اطالیہ ان کثیر التعداد شہری مملکتوں کا جائے وقوع بنا رہا تھا جن کی تاریخ
میں خصوصیت کے ساتھ یونانی دنیا کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ سولھویں صدی
کے شروع ہوتے ہوتے اتحاد و اتفاق اور اندرونی تقلیب کے مسلسل عمل کا

نتیجہ یہ ہوا تھا کہ کل جزیرہ نما عملاً پانچ مملکتوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ شاہی نیپلز، مملکت کلیسائی رومانی، ملان کی امارت، وینس اور فلورنس کی جمہوریتیں۔ مزید اتحاد واتفاق مزید ممکن معلوم ہوتا تھا اور فرانس واسپین کے نمونے پر ایک قومی بادشاہ کے تحت تمام ملک کا متحد ہو جانا وہ تصور تھا جو خصوصیت کے ساتھ میکیاولی کے دل میں موجزن تھا۔ لیکن اس خیال کے زیر عمل آنے میں صرف یہی مواقع نہیں تھے کہ موجود الوقت دینوی اطالوی مملکت میں باہمی رقابت تھی اور کوئی ایک فرماں روا ایسا نہیں تھا جس کے اخلاقی اثر اور مادی وسائل سے یہ متیقن ہو جائے کہ اطالیہ میں اس کی سرکردگی اس طرح مسلم ہو جائے گی جیسی فرڈی ننڈ کو اسپین میں حاصل ہو گئی تھی بلکہ پاپائیت کی خاص حیثیت اور حکمت عملی بھی اس کی مانع تھی۔

دانتے اور مازینی کی طرح میکیاولی بھی محب وطن تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ انگلستان، فرانس اور اسپین کی طرح اطالیہ میں بھی ایک طاقتور مرکزی حکومت وجود میں آئے جو اطالیہ کی دیرینہ اور گم شدہ عظمت کو دوبارہ زندہ کرے، اس کی خوابیدہ روح کو بیدار کرے اور اقوام یورپ میں اطالیہ کو صف اول میں ممتاز جگہ دلائے۔ جس طرح دانتے نے اطالوی ادب میں قومی رنگ پیدا کر کے ملی احساس کو بیدار کرنے کی کوشش کی تھی اس طرح میکیاولی نے سیاسی وحدت اور فرماں روا کی اطاعت کے نقطہ نظر کو پیش کر کے قوم پرستی کے جذبہ کو ابھارنا چاہا تھا۔ جن پر جوش اور پر خلوص الفاظ میں وہ اطالیہ کے سیاسی و ملی اتحاد کے لیے فریاد کرتا ہے۔ وہ اپنی فصاحت و بلاغت یا گھن گرج میں مازینی اور دانتے کے پر زور الفاظ سے کم نہیں۔ "حکمراں" کے آخری باب کا عنوان "اطالیہ کو وحشیوں سے آزاد کراؤ" اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس کا حقیقی منشا و مقصد کیا تھا۔ اگر حضرت موسیٰ کی قابلیت کے اظہار کے لیے بنی اسرائیل کا اہل مصر کی غلامی میں گرفتار ہونا اور سائرس (Cyrus) کی روحانی عظمت کا پتہ لگانے کے لیے اہل فارس کا میدیوں کا مورد جور و ستم ہونا اور تھی سیوس

(Theseus) کی صلاحیتوں کو منظر عام پر لانے کے لیے اہلِ ایتھنز (Athens) کا منتشر ہونا ضروری تھا تو پھر کسی اطالوی کی خوبی آشکار ہونے کی صورت یہی تھی کہ اطالیہ بے طرح مصیبتوں کا شکار ہو جیسا کہ اب ہے اور وہاں کے باشندے یہودیوں سے بدتر غلام، اہلِ فارس سے بڑھ کر مظلوم اور ایتھنز سے زیادہ غیر متحد ہوں۔ نہ ان کا کوئی سردار ہو اور نہ وہاں کسی قسم کا نظام۔ اس پر بری طرح مار پڑے، اسے خوب لوٹا جائے، اس کے ٹکڑے ٹکڑے کیے جائیں، وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک تاخت و تاراج کیا جائے اور اسے ہر قسم کی مصیبت سہنا پڑے۔"

"اب صورت یہ ہے کہ اطالیہ کے جسم میں جیسے جان ہی نہیں ہے۔ وہ اس کا منتظر ہے کہ کوئی آئے اور اس کے مرض کا علاج کرے۔ لمبارڈی (Lombardy) کی تباہی اور لوٹ کھسوٹ کو بند کرے۔ تسکانی (Tuscany) کی دھوکہ بازیوں اور زیادتیوں کا خاتمہ کرے اور ان زخموں کی مرہم پٹی کرے جو مدتوں سے سڑ رہے ہیں۔ وہ کس طرح خدا سے التجا کر رہا ہے کہ اے مالک تو کسی ایسے شخص کو بھیج جو ان مصیبتوں اور وحشیانہ ظلم و ستم سے چھٹکارا دلائے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک جھنڈے تلے جمع ہونے پر راضی ہے بشرطیکہ کوئی جھنڈا بلند کرنے والا ہو۔

"لہٰذا اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے اور چاہیے کہ اطالیہ اپنی رہائی دلانے والے کی بالآخر زیارت کرے۔ اس وقت جو کیفیت ہوگی اس کا نقشہ الفاظ کھینچنے سے قاصر ہیں۔ جہاں بیرونی حملہ آوروں کی ریل پیل رہی ہے وہاں اس کا کس جوش سے خیر مقدم ہوگا، کس شدت سے انتقام کی آگ بھڑکے گی، کیسی جاں نثاری ہوگی اور آنسو ہونگے کہ بس امڈے چلے آئیں گے۔ کون ہے جو اس کے لیے اپنا دروازہ نہ کھولے گا؟ کس کو اس کی اطاعت سے گریز کی مجال ہوگی؟ کس کا حسد اس کی راہ میں حائل ہو سکے گا؟ اطالیہ کا کون ایسا فرزند ہوگا جو اس کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرے گا؟ (حکمراں باب ۲۶)۔

۸۔میکیاولی: تنقیدی جائزہ

جو مقبولیت اور شہرت "حکمراں" کو حاصل ہوئی وہ میکیاولی کی کسی اور تصنیف کو نصیب نہیں ہوئی لیکن اس کی ذمہ داری میکیاولی پر نہیں بلکہ ان سیاسی لیڈروں اور حاکموں پر ہے جنہوں نے اپنی ذاتی اغراض اور سیاسی اقتدار کے حصول اور استحکام کے لیے "حکمراں" سے استفادہ کیا۔ اگرچہ یہ کتاب خاص حالات میں یعنی سولہویں صدی میں اطالیہ کی سیاسی زبوں حالی اطالوی ریاستوں کی باہمی چپقلش اور خانہ جنگی۔ اور ایک مقصد و نظریہ یعنی اطالیہ کے قومی اتحاد اور آزادی کے نصب العین کے تحت لکھی گئی تھی لیکن پھر بھی یہ خیال درست نہیں کہ "حکمراں" اس کے سیاسی نظریات کا صحیح ترجمان ہے کیوں کہ اگر اس کی جملہ تصانیف اور خاص کر "مقالات" کو ہم پیش نظر رکھیں تو "حکمراں" کی حیثیت صرف ایک باب یا ضمیمہ کی رہ جاتی ہے "مقالات" اور اس کی زندگی کے حالات کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ مطلق العنانی کا دل سے ہرگز مداح نہ تھا بلکہ جمہوریت کا شیدائی اور قومی آزادی کا نقیب و علم بردار تھا۔

میکیاولی سے قبل فلسفہ سیاسیات میں قوم من حیث القوم کسی خاص توجہ یا فکر کا موضوع نہ رہی تھی۔ اگرچہ میکیاولی کے دیکھتے دیکھتے فرانس اور انگلستان میں قومی یکجہتی اور قومی اتحاد کی تحریکیں روز بروز جڑ پکڑ رہی تھیں لیکن اس کے باوجود جہاں تک عملی سیاست کا تعلق تھا اقتدار اعلیٰ موروثی حکمرانوں ہی کی ذات سے وابستہ تھا۔ یہ نظریہ کافی عرصہ تک مقبول رہا کہ مملکت خدا کا بنایا ہوا ایک ادارہ ہے اور حقوق فرماں روائی اسی کی طرف سے عطا کردہ ہیں جنہیں حکمرانو سے چھینا نہیں جا سکتا۔ سترہویں صدی کے آغاز میں جیمس اول

(James I)

نے اپنی "آزاد شاہی کا قانون" (Law of Free Monarchies)
میں اس نظریہ کی وضاحت مندرجہ ذیل الفاظ میں کی تھی:

"اگرچہ ایک اچھے بادشاہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے افعال کو قانون کے مطابق رکھے مگر ایسا کرنے پر وہ مجبور نہیں۔ وہ اپنی مرضی کا مختار ہے اور اسے اپنے افعال سے اپنی رعایا کے لیے مثال قایم کرنی ہے ... بادشاہت ایک موروثی حق ہے اور بادشاہ کے حکم کی بے چون وچرا اطاعت مذہبی فرائض میں داخل ہے ... جس طرح اس امر میں بحث کرنا کہ خدا کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں کر سکتا، دہریت اور سوئے ادب ہے اسی طرح اس امر میں بحث کرنا کہ بادشاہ فلاں کام کر سکتا ہے اور فلاں کام نہیں کر سکتا، رعایا کی گستاخی اور بادشاہ کی سخت توہین ہے"

موروثی حکمرانی کے نظریہ اور حکمرانوں کے وسیع اقتدار و اختیار کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جنگ سی سالہ (Thirty years War) کے اختتام پر صلح ویسٹ فیلیا (Peace of West Phalia) نے حکمرانوں کے اس حق کو تسلیم کیا تھا کہ انہیں اپنی رعایا کے مذہبی اور ملکی معاملات پر کامل اختیار رہے۔ مزید برآں سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں انگلستان اور فرانس کی داخلی سیاسی کشمکش اور نظریاتی بحث ومباحثوں میں بھی قومی انفرادیت اور قومی حقوق (Rights of Nations) پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی بلکہ موضوع بحث یہ تھا کہ اگر فرماں روا اپنے اختیارات سے تجاوز کرے یا ان کا صحیح استعمال نہ کرے تو ایسی صورت میں شہری اپنے مفاد اور حقوق کی حفاظت کے لیے کیا ذرائع اور وسائل اختیار کریں۔ انقلاب فرانس اور امریکی جنگِ آزادی کے نعروں اور منشوروں کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ قومی انفرادیت کا جذبہ یا نظریہ اٹھارہویں صدی کی نظری اور عملی سیاست میں کارفرماں نہ تھا۔ قوم من حیث القوم نہیں بلکہ ابھی تک حقوق انسانی (Rights of Man) یعنی آزادی، اخوت، مساوات اور جستجوئے مسرت توجہ وفکر کا موضوع تھا۔ بقول ڈیلائل برنس (Delisle Burns)

"نشاۃ ثانیہ کے بعد کئی صدیاں گذریں اور جب تک نپولین کا زمانہ نہیں آیا قومیت کا خیال محض جذبہ کی شکل میں موجود تھا۔ اس کو کوئی جامہ نہیں پہنایا گیا لیکن یہ جذبہ تھا بہت زبردست"

دراصل حقیقت تو یہ ہے مسیحیت کے زوال کے ساتھ ساتھ ہی وطنیت اور حق پرستی کا نشو و نما شروع ہو چکا تھا۔ رومی کلیسا کی مخالفت میں مارٹن لوتھر (Martin Luther) نے اپنی جرمن قوم سے مدد لی تھی اور کلیسا کی شکست کے بعد وہ تسبیح ٹوٹ گئی جس میں مختلف قومیں گذری ہوئی تھیں۔ رفتہ رفتہ آفاقیت کی بجائے قومیت کو قابلِ قبول بلکہ واجب الحصول نصب العین قرار دیا گیا۔ لوتھین (Lord Lothian) کے الفاظ میں "جب لوتھر کی تحریک نے (جس کو دینی اصلاح کی تحریک کہا جاتا ہے) یورپ کے ثقافتی (کلچرل) اور دینی وحدت کا خاتمہ کر دیا تو براعظم مختلف قومی حکومتوں میں منقسم ہو گیا جن کے جھگڑے اور مقابلے دنیا کے امن کے لیے ایک دائمی اور مستقل خطرہ بن گئے" اور یہی وہ جذبہ تھا جس نے نپولین کے خلاف اہلِ ہسپانیہ کی جدوجہد (سنہ ۱۸۰۶ء سے ۱۸۱۴ء تک) کو تقویت بخشی تھی۔ یہ جذبہ قوم پرستی ہی کی کارفرمائی تھی جس کے سبب نپولین کو بالآخر شکست ہوئی اور جرمنی کو ازسرِ نو زندگی حاصل ہوئی۔ اسی کے تحت انیسویں صدی میں اقتدارِ اعلیٰ اور قانون سازی کے مسئلوں پر باقاعدہ توجہ دی گئی اور مبصرین و مفکرین سیاست نے اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کے مطابق قوم، مملکت اور قومی حقوق کی توضیح و توجیح کی۔ اس لحاظ سے یہ میکیاولی کا طرۂ امتیاز ہے کہ عصرِ جدید کا وہ پہلا سیاسی مفکر ہے جس نے نہ صرف قوم کی اہمیت کو تسلیم کیا بلکہ قومی آزادی اتحاد کو بجائے خود ایک ایسا اہم و بلند پایہ نصب العین قرار دیا کہ جس کے حصول کی خاطر ہر قسم کا حیلہ و حربہ جائز اور جس کے لیے ایک بیدار مغز شہری کو ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ صرف جان و مال کی قربانی نہیں بلکہ اصول و اخلاق کی بھی۔

اس میں شک نہیں کہ میکیاولی کا یہ نظریہ کہ عملی سیاست میں اخلاقیات کے بجائے سیاسی مصالح زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور قومی آزادی برقرار رکھنے

کے لیے ہر ممکن حیلہ و حربہ سے کام لینا چاہیے اور اس بنا پر حکمراں مذہبی یا اخلاقی قیود کو پسِ پشت ڈالنے میں حق بجانب ہے، بظاہر بہت ہی عجیب بلکہ قابلِ نفرت وحقارت معلوم ہوتا ہے مگر اس سلسلہ میں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ دانتے اور مازینی کی طرح میکیاولی بھی ایک محب وطن تھا جس کا دل و دماغ مادرِ وطن کی ابتری و بدحالی سے حد درجہ متاثر تھا۔ اطالیہ کے اتحاد کا وہ دل وجان سے خواہش مند تھا مگر اس اتحاد کے لیے ضروری تھا کہ ایک ایسا لیڈر یا حکمراں ہو جو اپنی طاقت اور سیاست سے اطالیہ کی طوائف الملوکی کا قلع وقمع کرے، غیر ملکیوں کو اطالیہ چھوڑنے پر مجبور کرے اور مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ایک دوسرے سے منسلک ومتحد کر کے اطالیہ میں جمہوری حکومت کی داغ بیل ڈالے۔ میکیاولی کے نزدیک یہ ایک ایسا بلند اور اہم نصب العین تھا جس کے حصول کے سلسلہ میں یہ خیال نہ ہونا چاہیے کہ اسے کن طریقوں سے حاصل کیا جا رہا ہے۔ اصل چیز مقصد ہے اور قومی آزادی اور ملکی فلاح وبہبود کے لیے جو بھی طریقہ اور حربہ استعمال میں لایا جائے وہ جائز ہے۔

جو نظریہ میکیاولی نے پیش کیا ہے اس کے سلسلہ ہمیں دو باتیں یاد رکھنا چاہئیں اول تو یہ کہ مملکت کوئی معمولی اور مصنوعی ادارہ نہیں، مملکت دراصل انسانوں کے اتحادِ عمل کا نام ہے جس کا نصب العین نہ صرف مادی فلاح بلکہ انسانی اور عمرانی زندگی کی تکمیل ہے اور اس لیے یہ سوال بہت اہم ہے کہ جب مملکت کا مستقبل خطرہ میں ہو اور قومی آزادی پر آنچ آ رہی ہو تو ایک محب وطن اور ایک قومی حکومت کیا کرے۔ بین الاقوامی سیاست کی یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ سیاسی آزادی، قومی ترقی اور ملک کی حفاظت ایسے نصب العین ہیں جن کی حفاظت وحصول کی خاطر حکومت خواہ شخصی ہو یا جمہوری، اشتراکی ہو یا جاگیردارانہ اس کی خارجہ پالیسی کا یہ آفاقی اصول ہے کہ "صرف قوم خواہ وہ غلطی پر ہی کیوں نہ ہو اور اپنا حلیف خواہ وہ ظالموں کا سرغنہ کیوں نہ ہو" نرمی صلح جوئی کو کمزوری پر محمول کیا جاتا ہے اور انہیں ملکوں کے سیاسی تعلقات زیادہ استوار اور مستحکم ہوتے ہیں جن کی حکومتوں کو اس بات پر اطمینان ہوتا ہے کہ

وقتِ ضرورت وہ ایک دوسرے کی ہر ممکن طریقہ سے مدد کریں گے۔ بین الاقوامی پیچیدگیوں اور جغرافیائی اور تاریخی اتفاقات وحادثات کے باعث جو اختلافات پیدا ہوئے ہیں اگر انہیں خوبصورت الفاظ کے استعمال سے حل کیا جاسکتا ہوتا تو آج ہم لوگ ایک ایسی فردوس ارضی کے شہری ہوتے جہاں نہ فوجیں ہوتیں اور نہ اسلحہ پر مفت اربوں روپیہ ضائع کیا جاتا۔

دو عالمی جنگوں کی تباہ کاریوں، اقوام متحدہ کے قیام، بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی سیاست کے بلند بانگ دعوں اور اخلاقی اصولوں کی تعلیم وترغیب کے باوجود آج بھی ہم مسائل ومشکلات کی ایسی پہاڑی پر چڑھ رہے ہیں جو بلند سے بلند تر ہوتی جارہی ہے۔ سیاسی مسائل کی تعداد اور وسعت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ ہمارے دور کی حیرت انگیز ٹیکنیکل اور سائنٹیفک ترقیوں نے جنگ اور آلاتِ جنگ کی تباہ کاری کی اس قوت میں (جو مملکتیں اپنی پالیسی کے وسیلہ کے طور پر استعمال کرتی رہی ہیں) بے اندازہ اضافہ کر دیا ہے۔ جوہری ہتھیاروں نے جغرافیائی سیاست میں ایک نیا موڑ پیدا کر کے انسان اور انسانیت کو موت وزیست کے دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے اور اقوام عالم کو اسی قسم کی سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور ذہنی وروحانی مسائل سے سابقہ ہے جن کا اطالیہ والوں کو سولہویں صدی میں مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ ہم ایک عجیب وغریب دور سے گذر رہے ہیں۔ ایک طرف تو مصنوعی سیارے فلک پیمائی کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور تسخیر خلا کے پروگرام بنائے جارہے ہیں، تو دوسری طرف آج کی متمدن ومہذب حکومتیں جن اصولوں پر عمل پیرا ہیں وہ وہی نظریات ہیں جنہیں میکیاولی سے معنون کیا جاتا ہے لیکن جو سینکڑوں برس قبل مسیح سے دنیا میں رائج ہیں یعنی "جن کے پاس قوت ہے وہی چیزوں کو حاصل کرینگے اور انہیں رکھ سکتے ہیں وہ ہی رکھ سکیں گے"۔

پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں "قومی عظمت کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ قوم کے پاس ایسی طاقت ہو جس سے بوقت ضرورت اپنی خواہش اور ارادہ کو دوسروں

پر مسلط کر سکے یہ قومی عظمت ان قوموں کے نزدیک آئیڈیل یا نصب العین کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کی نامعقولیت اسی سے ظاہر ہے کہ یہ معیار اخلاقی صفات کے بالکل ضد ہے اگر کوئی ملک ایسا ہے جو صرف سچ ہی بولتا ہے وعدے وفا کرتا ہے اور کمزوروں کیسا تھ انسانیت کا سلوک کرتا ہے تو ان قوموں کے نزدیک اس کی عزت کی سطح پست ہے، مسٹر بالڈون کے بقول عزت نام ہے اس قوت کا جس سے قوم خاص شرف و اعتبار کی مالک ہو ہنگاموں کو اپنی طرف متوجہ کرے اور ظاہر ہے کہ ایسی قوت جس سے قوم کو ایسا اعزاز و امتیاز حاصل ہو، موقوف ہے آتش فشاں گولوں پر اور بموں پر، ان نوجوانوں کی وفاداری اور وطن دوستی پر جن کا شہروں پر ان گولوں اور بموں کو پھینکنا ایک محبوب مشغلہ ہے۔ پس جس عزت کے لیے کسی قوم کی تعریف کی جاتی ہے وہ ان صفات و اخلاق کے بالکل ضد واقع ہوئی ہے۔ جن کی بنا پر فرد کی تعریف کی جاتی ہے۔ میرے نزدیک تو قوم کو اس قدر وحشی اور غیر مہذب سمجھا جائے جس قدر وہ ایسی عزت کی مالک ہو، فریب دہی، دغا بازی اور ظلم سے عزت حاصل کرنا کسی انسان اور قوم کے لیے قطعاً باعث عزت نہیں۔"

قوم پرستی اور مادیت کیوجہ سے مغربی تہذیب اور مغربی تمدن کے زیر اثر عصر حاضر کی عمرانی اور سیاسی زندگی میں علم و صفت اور اخلاق و انسانیت کے درمیان ایک ایسی خلیج پیدا کر دی جس کا سابقہ ہمیں ہر موڑ پر ہوتا ہے موجودہ تہذیب کی ناکامی پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر الکس کیرل (Dr Alexis Carrel) نے اپنی تصنیف (Man the Unknown) میں بجا طور پر لکھا:

"موجودہ زندگی انسان کو ترغیب دیتی ہے کہ وہ دولت کو ہر ممکن ذریعہ سے حاصل کرے لیکن یہ ذرائع انسان کو دولت کے مقصد تک نہیں پہنچاتے۔ یہ انسان میں ایک دائمی ہیجان اور جنسی خواہشات کی تسکین کا ایک سفلی جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ ان کے اثر سے انسان صبر و ضبط سے خالی ہو جاتا ہے اور ہر ایسے کام سے گریز کرنے لگتا ہے جو ذرا دشوار اور صبر آزما ہو،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب جدید ایسے انسان پیدا ہی نہیں کر سکتی جس میں فنی تخلیق ذکاوت اور جرأت ہو۔ ہر ملک کے صاحب اقتدار طبقہ میں جس کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور ہے، ذہنی اور اخلاقی قابلیت میں نمایاں انحطاط نظر آتا ہے، ہم محسوس کر رہے ہیں کہ تہذیب جدید نے ان بڑی بڑی امیدوں کو پورا نہیں کیا جو انسانیت نے اس سے وابستہ کی تھیں اور وہ ان لوگوں کے پیدا کرنے میں ناکام رہی جو ذہانت اور جرأت کے مالک ہوں اور تہذیب کو اسی دشوار گزار راستہ پر سلامتی کے ساتھ لے جا سکیں جن پر آج وہ ٹھوکریں کھا رہی ہے!